اسلام اور جدید معیشت و تجارت

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی

ادارۃ المعارف کراچی

اسلام اور
جدید معیشت و تجارت

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و کفیٰ ، وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

اما بعد :

موجودہ دور میں وسیع پیمانے کی تجارت و صنعت نے معاملات کی نئی نئی صورتیں اور ان سے متعلق نئے نئے مسائل پیدا کئے ہیں جن پر دنیا بھر میں غور ہو رہا ہے' اور ان کے مختلف حل سامنے لائے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ تجارت و معیشت نے مستقل علوم کی حیثیت اختیار کرلی ہے جن کی تعلیم عصری درس گاہوں میں دی جا رہی ہے۔

الحمد للہ' کچھ عرصے سے مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہونے لگا ہے کہ مغربی استعمار نے جو معاشی نظام عالم اسلام پر مسلط کیا ہے' اس کی خرابیوں سے نجات حاصل کر کے اپنی معاشی سرگرمیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ یہ فکر انفرادی اور اجتماعی سطح پر عالم اسلام کے ہر حصے میں بفضلہ تعالیٰ فروغ پا رہی ہے۔ انفرادی سطح پر وہ مسلمان تاجر اور صنعتکار جو دین پر عمل کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں' اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اپنا کاروبار حتی الامکان اسلامی تعلیمات کی روشنی میں چلائیں۔ اور اجتماعی سطح پر بھی یہ کوششیں مختلف ملکوں میں جاری ہیں کہ معیشت کو اسلامی احکام کے تابع بنایا جائے۔

ان دونوں قسم کی کوششوں کو قرآن و سنت اور اسلامی فقہ میں بصیرت رکھنے والے اہل علم کی رہنمائی کی شدید ضرورت ہے۔ لیکن مغربی استعمار کے دور میں علماء کرام اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی ہے کہ دونوں کے سوچنے کا انداز' دونوں کی زبان اور دونوں کی اصطلاحات اتنی مختلف ہیں کہ ایک کو دوسرے کی بات سمجھنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے' اس لئے ان مسائل پر باہمی گفتگو اور افادہ و استفادہ کی راہ میں شدید رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔

کم از کم معاشی مسائل کی حد تک اس خلیج کو دور کرنے' دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور دونوں کے درمیان افہام و تفہیم کا راستہ کھولنے کیلئے "مرکز الاقتصاد الاسلامی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جس نے دارالعلوم کراچی کے تعاون سے متعدد تربیتی کورس منعقد کئے۔ کچھ تربیتی کورس تاجروں' صنعتکاروں' مالیاتی اداروں اور معیشت کے دوسرے شعبوں سے متعلق افراد کیلئے منعقد کئے گئے جن میں انہیں تجارتی معاملات سے متعلق بنیادی اسلامی احکام سے روشناس کرایا گیا۔ یہ کورس اس لحاظ سے بفضلہ تعالیٰ انتہائی کامیاب رہے کہ ان میں معیشت کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد نے انتہائی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ شرکت کی' اور اپنے اپنے شعبے سے متعلق بنیادی اسلامی احکام سے آگاہ ہوئے۔ ان کورسوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔

دوسری طرف کچھ کورس علماء کرام اور خاص طور پر فتویٰ سے تعلق رکھنے والے حضرات کیلئے منعقد کئے گئے جن میں انہیں معیشت کے موجودہ تصورات اور عصر حاضر میں کاروبار کی مختلف صورتوں کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ تجارت و معیشت کے جن مسائل کا براہ راست تعلق فقہ سے ہے' ان کی موجودہ صورت حال وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ان کے علم میں آئے' تاکہ وہ اسے کما حقہ سمجھ کر اس کا فقہی حکم واضح کر سکیں۔

اس مقصد کیلئے انہیں پورا علم معاشیات یا پورا علم تجارت سکھانے کی ضرورت نہیں تھی' بلکہ ان دونوں کے صرف ان مباحث کا انتخاب پیش نظر تھا جو ان کی مذکورہ ضرورت کو پورا کر سکے۔ دوسری طرف ان کے سامنے ان موضوعات کی تفہیم کیلئے اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی شخص ان کے جانے پہچانے اسلوب اور ان کی اپنی زبان میں ان مسائل کی وضاحت کرے۔

لہذا بعض ابتدائی تجربوں کے بعد احقر نے یہ فیصلہ کیا کہ اس درس کی ذمہ داری میں خود اٹھاؤں' تاکہ مذکورہ دو ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ لیکن چونکہ معیشت و تجارت میرا اختصاصی موضوع نہیں ہے' اس لئے میں نے اپنے دو محترم دوستوں سے درخواست کی کہ وہ احقر کی معاونت کیلئے درس کے دوران موجود رہیں' تاکہ اگر میں کہیں غلطی کروں تو اس کی اصلاح کر دیں' اور بوقت ضرورت اضافی وضاحتیں بھی پیش کر سکیں۔

ان میں سے ایک جناب ڈاکٹر ارشد زمان صاحب تھے جو ہمارے ملک کے ممتاز ماہرین معاشیات میں سے ہیں' اور عرصۂ دراز تک ہماری وزارت خزانہ میں چیف اکنامسٹ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ وہ ماشاء اللہ پورے کورس میں۔ جو رجب ۱۴۱۳ھ

میں تقریباً چار ہفتے دارالعلوم کورنگی میں جاری رہا۔ بہ نفس نفیس موجود رہے' اور متعدد مواقع پر انہوں نے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ بالخصوص شرح مبادلہ کے مختلف نظاموں کے تعارف اور مالیات عامہ کے موضوعات پر انہوں نے باقاعدہ لیکچر بھی دیئے۔

دوسرے جناب سید محمد حسین صاحب تھے جو ہمارے ملک کے ممتاز چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں' اور اس حوالے سے ملک بھر میں معروف ہیں' وہ آج کل انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس کے چیئرمین بھی ہیں' اور مرکز الاقتصاد الاسلامی کے وائس چیئرمین بھی۔ انہوں نے بھی کورس کے ایک بڑے حصے میں شرکت فرمائی' اور اپنی معلومات سے احقر کی اور حاضرین کی رہنمائی کی' خاص طور پر "کمپنی کے حسابات" کے موضوع پر باقاعدہ لیکچر دیا۔

ان دو حضرات کی موجودگی احقر کیلئے بہت تقویت اور ہمت افزائی کا باعث بنی' اور اس طرح یہ کورس بفضلہ تعالیٰ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

یہ کورس چونکہ ایک تجرباتی نوعیت کا تھا' اس لئے اسے دارالعلوم کے اساتذہ اور تخصص کے طلبہ کی حد تک ہی محدود رکھا گیا تھا۔ البتہ فیصل آباد سے مولانا مفتی محمد مجاہد صاحب نے بھی جو دارالعلوم کے تخصص فی الافتاء کے فاضل ہیں' اور آج کل جامعہ امدادیہ میں استاذ حدیث اور مفتی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں' اس میں شرکت فرمائی' اور انہوں نے ہی اس پورے درس کو ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے تحریری شکل میں محفوظ کیا۔

چونکہ حاضرین نے اس کورس کی بہت افادیت محسوس کی' اس لئے اگلے سال یعنی جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ میں اسی قسم کے ایک اور کورس کا اہتمام کیا گیا جس میں شرکت کیلئے ملک کے منتخب دینی اداروں کے اساتذہ اور مفتی حضرات کو بھی دعوت دی گئی۔ چنانچہ اس کورس میں شرکت کیلئے ڈیرہ اسماعیل خان سے لیکر کراچی تک کے ممتاز دینی اداروں کے اساتذۂ کرام' مفتی حضرات اور اہل علم دارالعلوم کورنگی میں تشریف لائے' باہر سے تشریف لانے والوں کی تعداد پچاس تھی' ان کی سہولت کیلئے درس کا روزانہ دورانیہ بڑھا کر کورس کو دو ہفتوں میں سمیٹا گیا۔ اور اس مرتبہ بھی یہ خدمت احقر نے انجام دی۔ درس کے اختتام پر امتحان بھی ہوا' اور "مرکز الاقتصاد الاسلامی" کی طرف سے اس کی سند بھی جاری کی گئی۔

اس دوسرے کورس کے موقع پر احقر کو پچھلے تجربے اور نئے حالات کی روشنی میں درس کے موضوعات اور مضامین میں حذف و اضافہ کا بھی موقع ملا' اور اس طرح یہ دوسرا دورہ بحمد اللہ پہلے سے بھی زیادہ کامیاب اور مفید رہا۔

احباب کی طرف سے ضرورت محسوس کی گئی کہ اس درس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے' تاکہ وہ حضرات بھی اس سے متعارف ہو سکیں جو کورس میں شریک نہیں ہو سکے' نیز یہ تقاریر ایک مستقل افادیت کی حامل ہو سکیں۔ احقر اپنی مصروفیات کی بناء پر ان تمام تقاریر کو ضبط تحریر میں لانے سے قاصر تھا۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ مولانا مفتی محمد مجاہد صاحب نے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے جو تحریر تیار کی ہے' اسے شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ جو کتاب اس وقت آپ کے سامنے ہے' بنیادی طور پر یہ وہی تحریر ہے۔ البتہ احقر نے اس پر نظر ثانی کر کے مناسب ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ اور اب اسے اللہ تعالیٰ کے نام پر شائع کیا جا رہا ہے' لیکن اس تحریر کے بارے میں مندرجہ ذیل امور ذہن میں رکھنے ضروری ہیں:

۱) ---- یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے' بلکہ سلسلہ وار تقاریر کا مجموعہ ہے۔ مولانا مفتی محمد مجاہد صاحب نے یہ تقاریر لفظ بہ لفظ مرتب نہیں کیں' بلکہ تقاریر کا خلاصہ اور مغز اپنے الفاظ میں مرتب کیا ہے۔ لہٰذا انداز بیان میں اختصار ملحوظ رہا ہے۔ اور فاضل مرتب نے طویل بحثوں کو مختصر الفاظ اور تعبیرات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے' اس لئے عام قاری بعض جگہ شاید تشنگی محسوس کرے' لیکن امید ہے کہ اہل علم اسے قدرے توجہ سے پڑھیں گے تو انشاء اللہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

۲) ---- ان تقاریر کے براہ راست مخاطب علماء کرام تھے' اس لئے خاص طور پر فقہی بحثوں میں فقہی اصطلاحات بکثرت استعمال ہوئی ہیں۔ اور مضامین کا انتخاب بھی انہی کی ضرورت کے مطابق کیا گیا ہے۔

۳) ____ اگرچہ اس درس کا بنیادی مقصد موجودہ معیشت اور تجارت و صنعت کے اہم اجزاء کا تعارف تھا' تاکہ علماء کرام کیلئے ان مسائل پر غور و فکر اور تحقیق آسان ہو جائے' لیکن چونکہ پچھلے تقریباً دس بارہ سال سے یہ مسائل خود احقر کے غور و تحقیق کا موضوع رہے ہیں' اس لئے شرکاء درس کی خواہش تھی کہ میں ان مسائل کے بارے میں اپنی سوچ کا خلاصہ بھی ان کی خدمت میں پیش کروں' اس لئے ان مسائل پر احقر نے فقہی حیثیت سے بھی گفتگو کی ہے۔

اس گفتگو کے بارے میں احقر نے شرکاء درس پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس کی حیثیت محض ایک سوچ کی ہے۔ اور اسے اسلئے پیش کیا جا رہا ہے کہ اہل علم اس پر غور فرما سکیں۔ ان میں سے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا صریح حکم کتاب و سنت یا فقہ میں موجود نہیں ہے۔ اس لئے ان میں اجتماعی غور و تحقیق و استنباط کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ان تقاریر میں کسی بھی مسئلے سے متعلق جو فقہی گفتگو کی گئی ہے' وہ اس موضوع پر حرف آخر نہیں ہے' یہ مسائل اس لئے چھیڑے گئے ہیں تاکہ ان پر بحث و نظر کا دروازہ کھلے' احقر کی

یہ سوچ احقر کے ذاتی رجحان اور میلان کی آئینہ دار ضرور ہے۔ لیکن اسے ہر مسئلے میں احقر کی طرف سے حتمی فتویٰ بھی سمجھنا نہیں چاہئے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کتاب کا مطالعہ کیا جائیگا تو امید ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب فائدے اور دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ اگر اہل علم حضرات اسے پڑھ کر ان مسائل پر۔ جو اس وقت پورے عالم اسلام کو درپیش ہیں۔ امت مسلمہ کی رہنمائی کی طرف متوجہ ہوگئے تو میں سمجھونگا کہ بفضلہ تعالیٰ یہ محنت ٹھکانے لگی ہے' اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین کی صحیح فہم عطا فرمائیں' اور اس پر عمل کرنے اور روئے زمین پر اسے عملاً قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

محمد تقی عثمانی
دارالعلوم کراچی ۱۴

۲۱ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ

فہرست مضامین

مضمون | صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون | صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ و اصحابہ اجمعین

مضمون کا تعارف اور اس کی ضرورت

اس درس کا مقصد یہ ہے کہ جدید معاملات جس طریقے سے آج دنیا میں رائج ہیں اس کی کم از کم اجمالی واقفیت طلبہ کو حاصل ہو جائے تاکہ ان معاملات کی حقیقت سمجھنے کے بعد ان کے بارے میں شرعی احکام کی تحقیق کی جا سکے' آپ حضرات کو معلوم ہی ہے کہ فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ

"من جھل باھل زمانہ فھو جاھل"

(شرح عقود رسم المفتی ص ۹۸)

"جو آدمی اپنے اہل زمانہ سے واقف نہ ہو (یعنی اہل زمانہ کے طرز زندگی' ان کی معاشرت' ان کے معاشی معاملات اور ان کے مزاج و مذاق سے واقف نہ ہو) تو وہ جاہل ہے"

ایک عالم کیلئے جس طرح قرآن و سنت کے احکام سے واقف ہونا ضروری ہے اسی طرح اس کیلئے زمانہ کے "عرف" اور زمانہ کے حالات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اس کے بغیر وہ شرعی مسائل میں صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت امام محمد بن الحسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ ملتی ہے کہ فقہ کی تدوین کے دوران وہ باقاعدہ بازاروں میں جا کر تاجروں کے پاس بیٹھتے' اور ان کے معاملات کو

سمجھتے تھے اور یہ دیکھا کرتے تھے کہ کونسے طریقے بازار میں رائج ہیں' ظاہر ہے کہ ان کا مقصد خود تجارت کرنا نہیں تھا' وہ صرف یہ جاننے کیلئے ان تاجروں کے پاس بیٹھتے تھے کہ ان کے کیا طریقے ہیں اور ان کے درمیان آپس میں کیا عرف رائج ہے؟ اس لئے کہ ان چیزوں سے واقفیت ایک عالم اور بالخصوص ایک فقیہ اور مفتی کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اس کے بارے میں اس کے پاس سوال آئے تو وہ اس سوال کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو اس کے بغیر وہ صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جب کسی علاقے یا کسی معاشرے میں ناجائز کاروبار کی کثرت ہو تو چونکہ عالم اور مفتی صرف فتویٰ جاری کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک داعی بھی ہوتا ہے اسلئے اس کا کام اس حد پر جاکر ختم نہیں ہوجاتا کہ وہ صرف اتنا کہہ دے کہ فلاں کام ناجائز اور حرام ہے' بلکہ بحیثیت داعی اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کام کو ناجائز اور حرام کہنے کے بعد یہ بھی بتائے کہ اس کا متبادل حلال طریقہ کیا ہے؟ وہ متبادل قابل عمل بھی ہونا چاہئے اور شریعت کے احکام کے مطابق بھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ جب ان کے پاس قید خانے میں بادشاہ کا پیغام پہنچا اور خواب کی تعبیر ان سے پوچھی گئی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر تو بعد میں بتلائی کہ سات سال کا قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے نجات حاصل کرنے کا راستہ پہلے بتا دیا چنانچہ فرمایا کہ

"فما حصدتم فذروه في سنبله الا قليلا مما تاكلون"

اس آیت سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ داعیٔ حق صرف حرام کام کو حرام کہہ دینے پر اکتفا نہ کرے یا صرف کسی مصیبت کو بیان کرنے پر اکتفاء نہ کرے کہ یہ مصیبت آنے والی ہے بلکہ اپنے امکان کی حد تک اس سے نکلنے کا راستہ بھی بتائے اور یہ راستہ اسی وقت بتایا جا سکتا ہے جب آدمی معاملات اور حقائق سے واقف ہو' اسی بات کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ معاملات جدیدہ کے متعلق ایک درس تخصص کے نصاب میں شامل ہو۔ معاشیات آجکل ایک مستقل فن بن چکا ہے اور اس کے متخصص ماہرین ہوتے ہیں' اس وقت فن معاشیات کو بتمام وکمال پڑھانا پیش نظر نہیں ہے' بلکہ اس کے ان حصوں سے آپ کو متعارف کرانا ہے جن کی ضرورت ایک عالم اور فقیہ کو بحیثیت فقیہ پیش آتی ہے' اور جس کے بارے میں بکثرت سوالات بھی آتے ہیں' اور ان کا جواب تلاش کرنا ہوتا ہے۔ عموماً ماہرین معاشیات ایک عالم کی ان ضروریات سے واقف نہیں ہوتے جن کی عالم کو تحقیق مسائل میں ضرورت پیش آتی ہے اس لئے میں نے خود ہی اس درس کا اہتمام کیا۔

نظامہائے معیشت اور ان پر تبصرہ

دنیا میں اس وقت جو مختلف معاشی نظام رائج ہیں ان میں دو نظام سب سے زیادہ نمایاں ہیں' ایک سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) جس کو عربی میں "الرأسمالیۃ" کہتے ہیں' اور دوسرا اشتراکی نظام (Socialism) جس کو عربی میں "الاشتراکیۃ" کہتے ہیں' اسی کی انتہائی صورت اشتمالیت (Communism) ہے جسے عربی میں "الشیوعیۃ" کہا جاتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ کاروبار یا معاملات ہو رہے ہیں وہ انہی دو نظاموں کے ماتحت ہو رہے ہیں' سوویت یونین کے زوال کے بعد اگرچہ سوشلزم ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے تو ختم ہو چکا اور اس کے ساتھ ہی اس نظریئے کی طاقت بھی کمزور پڑ گئی ہے لیکن ایک معاشی نظریہ کے اعتبار سے وہ دنیا کے معاشی نظریات میں اب بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے اس لئے اس کو سمجھنا بھی ضروری ہے' لہٰذا سب سے پہلے ان دو معاشی نظاموں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے اور پھر ان کے مقابلے میں اسلام کے وجوہ امتیاز کو بیان کیا جائیگا۔

بنیادی معاشی مسائل

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ معیشت کیا ہوتی ہے؟ اور اس کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ آج جس کو ہم اردو میں "معاشیات" کہتے ہیں وہ درحقیقت انگریزی کے لفظ "اکنامکس" (Economics) کا ترجمہ ہے' اور دراصل "اکنامکس" کا صحیح ترجمہ "معاشیات" نہیں ہے' بلکہ اس کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو عربی میں لفظ "اقتصاد" سے کیا جاتا ہے اور اسی لفظ سے یہ بات نکل رہی ہے کہ یہ مفروضہ تمام معاشی افکار میں تسلیم کیا گیا ہے کہ "انسانی ضروریات اور خواہشات انسانی وسائل کے مقابلے میں زیادہ ہیں" اور "ضروریات" کا لفظ جب موجودہ معیشت میں استعمال ہوتا ہے تو اس میں خواہشات بھی داخل ہوتی ہیں۔ غرض انسانی وسائل محدود ہیں اور اس کے مقابلے میں ضروریات اور خواہشات بہت زیادہ ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لامحدود ضروریات اور خواہشات کو محدود وسائل کے ذریعہ کس طرح پورا کیا جائے؟

"اقتصاد" اور "اکنامکس" کے یہی معنی ہیں کہ ان وسائل کو اس طریقے سے

استعمال کیا جائے کہ ان کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اس وجہ سے اس علم کو "اکنامکس" اور "اقتصاد" کہتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے ہر معیشت میں کچھ بنیادی مسائل ہوتے ہیں جن کو حل کئے بغیر وہ معیشت نہیں چل سکتی' عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بنیادی مسائل چار ہوتے ہیں۔

۱)۔۔۔ ترجیحات کا تعین۔(Determination of Priorities)

پہلا مسئلہ جسکو معیشت کی اصطلاح میں "ترجیحات کا تعین" کہا جاتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات بے شمار ہیں اور ان کے مقابلے میں وسائل محدود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان محدود وسائل کے ذریعہ تمام ضروریات اور خواہشات پوری نہیں ہو سکتیں لہذا کچھ ضروریات اور خواہشات کو مقدم کرنا پڑے گا اور کچھ کو مؤخر کرنا پڑے گا۔ لیکن کونسی ضرورت کو مقدم کیا جائے اور کونسی ضرورت کو مؤخر کیا جائے؟ مثلاً میرے پاس پچاس روپے ہیں ان پچاس روپے سے آٹا بھی خرید سکتا ہوں، کپڑا بھی خرید سکتا ہوں' کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ریفریشمنٹ کھانے پر بھی خرچ کر سکتا ہوں۔ یہ چار پانچ اختیارات (Options) میرے سامنے ہیں اب میں یہ پچاس روپے ان میں سے کس کام پر خرچ کروں؟ اس کو "ترجیحات کا تعین" کہا جاتا ہے۔

یہ مسئلہ جس طرح ایک انسان کو پیش آتا ہے اسی طرح پورے ملک اور پوری ریاست کو بھی پیش آتا ہے مثلاً پاکستان کے کچھ قدرتی وسائل ہیں۔ کچھ انسانی وسائل ہیں' کچھ معدنی وسائل ہیں، کچھ نقد وسائل ہیں۔ یہ سارے وسائل محدود ہیں اور اس کے مقابلے میں ضروریات اور خواہشات لامتناہی ہیں۔ اب یہ متعین کرنا پڑے گا کہ ان وسائل کو کس کام میں صرف کیا جائے؟ اور کس چیز کی پیداوار کو ترجیح دیجائے؟ اس مسئلہ کا نام "ترجیحات کا تعین" ہے۔

۲) وسائل کی تخصیص۔(Allocation of Resources)

دوسرا مسئلہ ہے "وسائل کی تخصیص" ہمارے پاس وسائل پیداوار ہیں یعنی سرمایہ' محنت' زمین' ان کو ہم کن کاموں میں کس مقدار میں لگائیں؟ مثلاً ہماری زمینیں ہیں' اب کتنی زمین پر ہم گندم کی کاشت کریں؟ کتنی زمین پر چاول کی کاشت کریں؟ اور کتنی زمین پر روئی کی کاشت کریں؟ یا اسی طرح ہمارے پاس کارخانے لگانے کی صلاحیت ہے جس سے ہم کپڑا بھی بنا سکتے ہیں' جوتے بھی بنا سکتے ہیں' اور کھانے پینے کی اشیاء بھی بنا سکتے ہیں' اب کتنے کارخانوں کو کپڑا بنانے میں استعمال کریں؟ اور کتنے کارخانوں کو جوتے بنانے میں لگائیں اور کتنے کارخانوں کو کھانے پینے کی اشیاء میں استعمال کریں؟' اس سوال کے تعین کو معیشت کی اصطلاح میں "وسائل کی تخصیص" کہا جاتا ہے۔

۳) آمدنی کی تقسیم (Distribution of income)

تیسرا مسئلہ ہے "آمدنی یا پیداوار کی تقسیم" یعنی مندرجہ بالا وسائل کو کام میں لگانے کے بعد اس کے نتیجے میں جو پیداوار یا جو آمدنی حاصل ہوئی اس کو کس طرح معاشرے میں تقسیم کیا جائے؟ اور کس بنیاد پر تقسیم کیا جائے؟ اسکو معاشیات کی اصطلاح میں "آمدنی کی تقسیم" کہا جاتا ہے۔

۴) ترقی ----- (Development)

چوتھا مسئلہ ہے "ترقی" یعنی اپنی معاشی حاصلات کو کس طرح ترقی دیجائے؟ تاکہ جو پیداوار حاصل ہورہی ہے وہ معیار کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اچھی ہو' اور مقدار کے اعتبار سے اس میں اضافہ ہو' اور کس طرح نئی نئی ایجادات اور مصنوعات وجود میں لائی جائیں تاکہ معاشرہ ترقی کرے اور لوگوں کے پاس اسباب معیشت میں اضافہ ہو اور لوگوں کو آمدنی کے ذرائع میسا ہوں۔ اس مسئلہ کو معاشیات کی اصطلاح میں "ترقی" کہا جاتا ہے۔

یہ چار بنیادی مسائل ہیں جنہیں حل کرنا ہر معاشی نظام کیلئے ضروری ہے' یعنی ترجیحات کا تعین' وسائل کی تخصیص' آمدنی کی تقسیم' اور ترقی۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مسائل اگرچہ فطری مسائل ہیں' لیکن ایک نظام کے تحت ان کو سوچنے' ان کا حل تلاش کرنے کی فکر آخر صدیوں میں زیادہ پیدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں دو متقابل نظریات ہمارے سامنے آئے ایک سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) اور دوسرا اشتراکی نظام (Socialism)۔

سرمایہ دارانہ نظام

(Capitalism)

سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں سمجھئے کہ اس نے ان چار مسائل کو کن بنیادوں پر حل کرنے کا دعویٰ کیا ہے؟ اور ان کو حل کرنے کیلئے کیا فلسفہ پیش کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا یہ ہے کہ ان چاروں مسائل کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر انسان کو تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کیلئے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے' اور اسے یہ چھوٹ دی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کیلئے جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کرے۔ اس سے معیشت کے مذکورہ بالا چاروں مسائل آپ ہی آپ حل ہوتے چلے جائیں گے۔ کیونکہ جب ہر شخص کی فکر یہ ہوگی کہ میں زیادہ سے زیادہ نفع کماؤں تو ہر شخص معیشت کے میدان میں وہی کام کریگا جس کی معاشرے کو ضرورت ہے۔ اور اس کے نتیجے میں چاروں مسائل خود بخود ایک خاص توازن کے ساتھ طے ہوتے چلے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ چاروں مسائل خود بخود کس طرح حل ہوں گے؟ اس سوال کے جواب کیلئے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

اس تفصیل کیلئے مندرجہ ذیل نکات قابل ذکر ہیں:

(ا)--- درحقیقت اس کائنات میں بہت سے قدرتی قوانین کارفرما ہیں' جو ہمیشہ ایک جیسے نتائج پیدا کرتے ہیں' انہی میں سے ایک قانون رسد (Supply) اور طلب (Demand) کا بھی ہے۔ رسد کسی بھی سامانِ تجارت کی اس مجموعی مقدار سے عبارت ہے جو بازار میں فروخت کیلئے لائی گئی ہو اور طلب خریداروں کی اس خواہش کا نام ہے کہ وہ یہ سامانِ تجارت قیمتاً بازار سے خریدیں۔ اب رسد و طلب کا قدرتی قانون یہ ہے کہ بازار میں جس چیز کی رسد طلب کے مقابلے میں زیادہ ہو' اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے اور جس چیز کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں بڑھ جائے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً گرمی کے موسم میں جب گرمی زیادہ پڑنے لگے تو بازار میں برف کے خریدار زیادہ ہو جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ برف کی طلب بڑھ گئی۔ اب اگر برف کی مجموعی پیداوار یا بازار میں پائی جانے والی برف کی مجموعی مقدار اس طلب کے مقابلے میں کم ہو' تو یقیناً برف کی قیمت بڑھ جائیگی۔ الا یہ کہ اس وقت برف کی پیداوار میں اتنا ہی اضافہ ہو جائے جتنا

طلب میں اضافہ ہوا ہے تو پھر قیمت نہیں بڑھے گی۔ دوسری طرف سردی کے موسم میں برف کے خریدار کم ہو جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ برف کی طلب گھٹ گئی۔ اب اگر بازار میں برف کی مجموعی مقدار اس طلب کے مقابلے میں زیادہ ہو تو یقیناً برف کی قیمت میں کمی آجائیگی۔ یہ ایک قدرتی قانون ہے۔ جس کو قانون رسد و طلب (Law of Demand and Supply) کہا جاتا ہے۔

(۲)--- سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ رسد و طلب کا یہ قدرتی قانون ہی درحقیقت زراعت پیشہ افراد کیلئے اس بات کا تعین کرتا ہے کہ وہ اپنی زمینوں میں کیا چیز اگائیں۔ اور یہی قانون صنعت کاروں اور تاجروں کیلئے اس بات کا تعین کرتا ہے کہ وہ کیا چیز کتنی مقدار میں بازار میں لائیں۔ اور اس طرح معیشت کے چاروں مذکورہ بالا مسائل خود بخود طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

(۳)--- طلب و رسد کے قانون سے ترجیحات کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ جب ہم نے ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کیلئے آزاد چھوڑ دیا تو ہر شخص اپنے منافع کے خاطر وہی چیز بازار میں لانے کی کوشش کریگا، جس کی ضرورت یا طلب زیادہ ہوگی، تاکہ اسے اس کی زیادہ قیمت مل سکے۔ زراعت پیشہ افراد وہی چیزیں اگانے کو ترجیح دیں گے جن کی بازار میں طلب زیادہ ہے اور صنعت کار وہی مصنوعات تیار کرنے کی کوشش کریں گے جن کی بازار میں زیادہ مانگ ہے۔ کیونکہ اگر یہ لوگ ایسی چیزیں بازار میں لائیں، جن کی طلب کم ہے، تو انہیں زیادہ منافع نہیں مل سکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص اگرچہ اپنے منافع کے خاطر کام کر رہا ہے، لیکن رسد و طلب کی قدرتی طاقتیں اسے مجبور کر رہی ہیں کہ وہ معاشرے کی طلب اور ضرورت کو پورا کرے۔ یہاں تک کہ جب کسی چیز کی پیداوار بازار میں اتنی آجائے کہ وہ اس کی طلب کے برابر ہو جائے تو اب اسی چیز کا مزید پیدا کرنا چونکہ تاجر اور صنعتکار کیلئے نفع بخش نہیں ہوگا، اس لئے اب وہ اس کی پیداوار بند کر دے گا۔ اس طرح معاشرے میں صرف وہی چیزیں پیدا ہوں گی جن کی معاشرے کو ضرورت ہے۔ اور اتنی ہی مقدار میں پیدا ہوں گی جتنی اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے واقعتاً درکار ہے۔ اور اسی کا نام ترجیحات کا تعین ہے۔

(۴) وسائل کی تخصیص۔ (Allocation of Resources)

اس کا تعلق بھی درحقیقت ترجیحات کے تعین ہی سے ہے، جب کوئی شخص ترجیحات کا باقاعدہ تعین کر لیتا ہے تو اسی حساب سے موجودہ وسائل کو مختلف کاموں میں لگاتا ہے۔ لہٰذا رسد و طلب کے قوانین جس طرح ترجیحات کا تعین کرتے ہیں، اسی طرح وسائل کی تخصیص کا کام بھی ساتھ ساتھ انجام دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہر شخص اپنے

وسائل یعنی زمین، سرمایہ اور محنت کو اسی کام میں لگاتا ہے تاکہ وہ ایسی چیزیں بازار میں لاسکے جن کی بازار میں طلب زیادہ ہے اور اسے منافع زیادہ حاصل ہو۔ لہذا رسد و طلب کے قوانین کے ذریعہ وسائل کی تخصیص کا مسئلہ بھی خود بخود طے ہو جاتا ہے۔

۵۔۔۔ تیسرا مسئلہ آمدنی کی تقسیم کا ہے۔ یعنی عمل پیدائش کے نتیجے میں جو پیداوار یا آمدنی حاصل ہوئی، اسے معاشرے میں کس بنیاد پر تقسیم کیا جائے؟ سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا یہ ہے کہ جو کچھ آمدنی حاصل ہو وہ انہی عوامل کے درمیان تقسیم ہونی چاہئے جنہوں نے پیدائش کے عمل میں حصہ لیا۔ سرمایہ دارانہ فلسفے کے مطابق یہ عوامل کل چار ہیں۔

۱۔ زمین ۲۔ محنت ۳۔ سرمایہ ۴۔ آجر یا تنظیم۔

آجر یا تنظیم سے مراد وہ شخص ہے جو ابتداءً کسی عمل پیدائش کا ارادہ کر کے پہلے تین عوامل کو اس کام کے لئے اکٹھا کرتا ہے اور نفع نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا یہ ہے کہ عمل پیدائش کے نتیجے میں جو کچھ آمدنی ہو وہ اس طرح تقسیم ہونی چاہئے کہ زمین مہیا کرنے والے کو کرایہ دیا جائے، محنت کرنے والے کو اجرت دی جائے۔ سرمایہ فراہم کرنے والے کو سود دیا جائے۔ اور وہ آجر جو اس عمل پیدائش کا اصل محرک تھا، اسے منافع دیا جائے۔ یعنی زمین کا کرایہ محنت کی اجرت اور سرمایہ کا سود ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے وہ آجر کا منافع ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تعین کس طرح ہو کہ زمین کو کتنا کرایہ دیا جائے گا؟ محنت کو کتنی اجرت دی جائے گی؟ اور سرمایہ کو کتنا سود دیا جائے گا؟ اس سوال کے جواب میں سرمایہ دارانہ فلسفہ پھر اس قانون رسد و طلب کو پیش کرتا ہے، یعنی یہ کہتا ہے ان تینوں عوامل کے معاوضے کا تعین ان کی طلب و رسد ہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ان عوامل میں سے جس عامل کی طلب زیادہ ہوگی اس کا معاوضہ بھی اتنا زیادہ ہو گا۔

فرض کیجئے کہ زید ایک کپڑے کا کارخانہ لگانا چاہتا ہے چونکہ وہ اس صنعت کے قائم کرنے کا محرک ہے اور وہی نفع نقصان کا خطرہ مول لیکر عوامل پیداوار کو اکٹھا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس لئے معاشی اصطلاح میں اس کو "آجر" (Entrepreneur) کہا جاتا ہے۔ اب اسے کارخانہ لگانے کے لئے پہلے تو زمین کی ضرورت ہے۔ اگر زمین اس کے پاس نہیں ہے تو اسے کہیں سے کرایہ پر لینی پڑے گی۔ اب اس کرایہ کا تعین زمین کی رسد و طلب کی بنیاد پر ہو گا۔ یعنی اگر زمین کرایہ پر دینے والے بہت سے ہیں یعنی زمین کی رسد زیادہ ہے اور لینے والے اس کے مقابلے میں کم ہیں یعنی طلب کم ہے تو زمین کا کرایہ سستا ہو گا اور اگر اس کے برعکس صورت ہو تو زمین کا کرایہ مہنگا ہو گا۔ اس طرح رسد و طلب

کے قوانین کرایہ کا تعین کریں گے۔

پھر اسے کارخانے میں کام کرنے کے لئے مزدور درکار ہوں گے' جن کو معاشی اصطلاح میں محنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انہیں اجرت دینی پڑے گی۔ اس اجرت کا تعین بھی رسد وطلب کی بنیاد پر ہوگا۔ یعنی اگر بہت سے مزدور کام کرنے کے لئے تیار ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محنت کی رسد زیادہ ہے۔ لہٰذا اسکی اجرت کم ہوگی۔ لیکن اگر اس کارخانے میں کام کرنے کے لئے زیادہ مزدور مہیا نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی رسد کم ہے۔ لہٰذا انہیں زیادہ اجرت دینی پڑے گی۔ اس طرح اجرت باہمی گفت و شنید کے نتیجے میں اس مقام پر متعین ہوگی' جس پر رسد وطلب دونوں کا اتفاق ہو جائے۔

اسی طرح کارخانہ لگانے والے کو مشینری اور خام مال وغیرہ خریدنے کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ جس پر سرمایہ دارانہ نظام میں اسے سود دینا پڑے گا۔ اس سود کی مقدار بھی رسد وطلب کی بنیاد پر طے ہوگی۔ اگر قرض دینے والے بہت سے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ کی رسد زیادہ ہے لہٰذا کم شرح سود پر کام چل جائے گا لیکن اگر سرمایہ کو قرض دینے والے کم ہیں تو زیادہ شرح سود ادا کرنی پڑے گی۔ اس طرح شرح سود کا تعین بھی رسد وطلب کی بنیاد پر ہوگا اور جب رسد وطلب کی مذکورہ بنیادوں پر کرایہ' اجرت اور سود کا تعین ہو گیا تو کارخانے کی پیداوار کے نتیجے میں جو آمدنی ہوگی' اس کا باقی ماندہ حصہ آجر کو نفع کے طور پر ملے گا۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ آمدنی کی تقسیم کا بنیادی مسئلہ بھی سرمایہ دارانہ نظام میں رسد وطلب کے قوانین کے تحت انجام پاتا ہے۔

۴۔۔۔ چوتھا معاشی مسئلہ ترقی کا ہے یعنی ہر معیشت کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیداوار کو ترقی دے اور اپنی پیداوار میں کمّاً اور کیفاً اضافہ کرے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے کے مطابق یہ مسئلہ بھی اسی بنیاد پر حل ہوتا ہے کہ ہر شخص کو جب زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے آزاد چھوڑا جائے گا تو رسد وطلب کے قدرتی قوانین اسے خود بخود اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ نئی سے نئی چیزیں اور بہتر سے بہتر کوالٹی بازار میں لائے' تاکہ اس کی مصنوعات کی طلب زیادہ ہو اور اسے زیادہ نفع حاصل ہو۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اصول

سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصول تین ہیں۔

۱) ذاتی ملکیت ـ (Private Property)

پہلا اصول یہ ہے کہ اس نظام میں ہر انسان کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی ملکیت میں اشیاء بھی رکھ سکتا ہے اور وسائل پیداوار بھی رکھ سکتا ہے۔ اشتراکی نظام میں اگرچہ ذاتی استعمال کی اشیاء تو ذاتی ملکیت میں آسکتی ہیں لیکن وسائلِ پیداوار مثلاً زمین یا کارخانہ، عموماً ذاتی ملکیت میں نہیں ہوتے، البتہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہر قسم کی چیز چاہے وہ استعمالی اشیاء سے تعلق رکھتی ہو یا اشیائے پیداوار میں سے ہو وہ ذاتی ملکیت میں آسکتی ہے۔

۲)---ذاتی منافع کا محرک ـ (Profit Motive)

دوسرا اصول یہ ہے کہ پیداوار کے عمل میں جو محرک کارفرما ہوتا ہے وہ ہر انسان کے ذاتی منافع کے حصول کا محرک ہوتا ہے۔

۳)---حکومت کی عدم مداخلت ـ (Laissez Faire)

سرمایہ دارانہ نظام کا تیسرا اصول یہ ہے کہ حکومت کو تاجروں کی تجارتی سرگرمیوں میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے وہ جس طرح کام کر رہے ہیں ان کی معاشی سرگرمی میں رکاوٹ نہ ڈالنی چاہئے، نہ ان پر حکومت کی طرف سے زیادہ پابندیاں عائد کرنی چاہئیں عام طور پر اس اصول کیلئے (Laissez Faire) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اصل میں یہ فرانسیسی لفظ ہے یعنی "حکومت کی عدم مداخلت کی پالیسی" اور اسکے معنی ہیں "کرنے دو" یعنی حکومت سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ اپنی معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہیں وہ جس طرح بھی کام کر رہے ہیں انکو کرنے دو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالو۔ اور حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ فلاں کام کرو، فلاں کام نہ کرو، اور نہ یہ حق ہے کہ وہ یہ کہے کہ اس طرح تجارت کرو اس طرح نہ کرو۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا تیسرا اصول ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کا اصل بنیادی فلسفہ یہی ہے۔

اگرچہ بعد میں خود سرمایہ دارانہ ممالک میں رفتہ رفتہ اس پالیسی کو محدود کر دیا گیا اور عملاً ایسا نہیں ہوا کہ حکومت بالکل مداخلت نہ کرے۔ بلکہ حکومت کی طرف سے بہت سی پابندیاں سرمایہ دارانہ ممالک میں نظر آئیں گی مثلاً کبھی ٹیکسوں کے ذریعہ بہت سی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں یا کسی کام کی ہمت افزائی کیلئے حکومت بہت سے اقدامات کرتی ہے۔ آج پوری دنیا میں کوئی ملک ایسا موجود نہیں ہے جس میں تجارت کے اندر حکومت کی بالکل مداخلت موجود نہ ہو۔ لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کا بنیادی فلسفہ یہی تھا کہ حکومت مداخلت نہ کرے۔ بلکہ تاجروں کو کھلی چھٹی دیدے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ "سب سے اچھی حکومت وہ ہے جو کم حکومت کرے" یعنی مداخلت نہ کرے۔

چونکہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ذاتی منافع کا محرک کارفرما ہوتا ہے اسلئے اسکو "سرمایہ دارانہ نظام" کہتے ہیں اور اسکا دوسرا نام ہے "مارکیٹ اکانومی" (Market Economy) یعنی بازار پر مبنی معیشت' اسلئے کہ اس میں مارکیٹ کی قوتوں (Market Forces) یعنی رسد اور طلب سے کام لیا جاتا ہے۔

اشتراکیت

(Socialism)

اشتراکیت در حقیقت سرمایہ دارانہ نظام کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئی۔ سرمایہ دارانہ فلسفے کا پورا زور چونکہ اس بات پر تھا کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے ہر شخص آزاد ہے۔ اور معیشت کا ہر مسئلہ بنیادی طور پر صرف رسد و طلب کی بنیاد پر طے ہوتا ہے۔ اس لئے اس فلسفے میں فلاح عامہ اور غریبوں کی بہبود وغیرہ کا کوئی واضح اہتمام نہیں تھا۔ اور زیادہ منافع کمانے کی دوڑ میں کمزور افراد کے پسنے کے واقعات بکثرت پیش آئے۔ جس کے نتیجے میں غریب اور امیر کے درمیان فاصلے بہت زیادہ بڑھ گئے۔ اس لئے اشتراکیت ان خرابیوں کے سدِباب کا دعویٰ لیکر میدان میں آئی۔ اور اس نے سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی فلسفے کو چیلنج کرتے ہوئے یہ ماننے سے انکار کیا کہ معیشت کے مذکورہ بالا چار بنیادی مسائل محض ذاتی منافع کے محرک، شخصی ملکیت اور بازار کی قوتوں کی بنیاد پر حل کئے جاسکتے ہیں۔

اشتراکیت نے کہا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں معیشت کے تمام بنیادی مسائل کو رسد و طلب کی اندھی بہری طاقتوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ جو خالصتاً ذاتی منافع کے محرک کے طور پر کام کرتی ہیں اور ان کو فلاح عامہ کے مسائل کا ادراک نہیں ہوتا۔ خاص طور سے آمدنی کی تقسیم میں یہ قوتیں غیر منصفانہ نتائج پیدا کرتی ہیں۔ جس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر مزدوروں کی رسد زیادہ ہو تو ان کی اجرت کم ہو جاتی ہے اور بسا اوقات مزدور اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ انتہائی کم اجرت پر کام کریں اور جو پیداوار ان کے گاڑھے پسینے کی محنت سے تیار ہو رہی ہے اس میں سے انہیں اتنا بھی حصہ نہ مل سکے جس کے ذریعہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے صحت مند زندگی کا انتظام کر سکیں۔ چونکہ ان کی محنت کی طلب رکھنے والے سرمایہ دار کو اس سے غرض نہیں کہ جس اجرت پر وہ ان سے محنت لے رہا ہے وہ واقعتاً ان کی محنت کا مناسب صلہ اور ان کی ضروریات کا واقعی کفیل ہے یا نہیں؟ اسے تو صرف اس بات سے غرض ہے کہ رسد کی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنی طلب کی تسکین نہایت کم اجرت پر کر سکتا ہے، جس سے اس کے منافع میں اضافہ ہو۔ لہٰذا اشتراکیت کے نظریہ کے مطابق آمدنی کی تقسیم کے لئے رسد و طلب کا فارمولا ایک ایسا بے حس فارمولا ہے جس میں غریبوں کی ضروریات کی رعایت نہیں، بلکہ وہ سرمایہ دار کے ذاتی

منافع کے محرک کا تابع ہے اور اسی مدار پر گردش کرتا ہے۔

اسی طرح ترجیحات کے تعین' وسائل کی تخصیص اور ترقی جیسے اہم معاشی مسائل بھی اشتراکیت کے نزدیک رسد و طلب کی اندھی بہری قوتوں کے حوالے کرنا معاشرے کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ ایک نظریاتی فلسفے کے طور پر تو یہ بات درست ہو سکتی ہے کہ ذاتی منافع کے محرک کے تحت ایک زراعت پیشہ شخص' یا ایک صنعت کار اس وقت تک اپنی پیداوار جاری رکھے گا جب تک کہ اس کی رسد طلب کے برابر نہ ہو جائے اور جب رسد طلب سے بڑھنے لگے گی تو وہ پیداوار بند کر دے گا۔ لیکن عملی دنیا میں دیکھا جائے تو کسی تاجر یا زراعت پیشہ کے پاس ایسا کوئی نپا تلا پیمانہ نہیں ہوتا جس کی مدد سے وہ بروقت یہ جان سکے کہ اب فلاں پیداوار کی رسد طلب کے برابر ہو گئی ہے۔ لہٰذا وہ بسا اوقات یہ سوچ کر پیداوار میں اضافہ کرتا جاتا ہے کہ ابھی اس چیز کی رسد ضرورت اور طلب کے مقابلے میں کم ہے۔ حالانکہ بازار میں حقیقی رسد زیادہ ہو چکی ہوتی ہے اور اسے اس حقیقت کا پتہ کافی دیر میں چلتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بازار میں بسا اوقات ایسی چیزوں کی فراوانی ہو جاتی ہے' جن کی طلب اتنی زیادہ نہیں ہے اور اس طرح معیشت کساد بازاری کا شکار ہوتی ہے' جس کے نتیجے میں بہت سے کارخانے بند ہو جاتے ہیں' تاجر دیوالیہ ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کی معاشی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا محض رسد و طلب کی بنیاد پر ترجیحات کا تعین اتنے توازن کے ساتھ نہیں ہو سکتا جس کی معاشرے کو واقعی ضرورت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا چاروں مسائل کو حل کرنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ اس کے جواب میں اشتراکیت نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ بنیادی خرابی یہاں سے پیدا ہوئی کہ وسائل پیداوار یعنی زمینوں اور کارخانوں کو لوگوں کی انفرادی ملکیت قرار دیدیا گیا۔ ہونا یہ چاہئے کہ تمام وسائل پیداوار افراد کی شخصی ملکیت میں ہونے کے بجائے ریاست کی اجتماعی ملکیت میں ہوں اور جب یہ سارے وسائل ریاست کی ملکیت میں ہوں گے تو حکومت کو یہ پتہ ہوگا کہ اس کے پاس کل وسائل کتنے ہیں؟ اور معاشرے کی ضروریات کیا کیا ہیں؟ اس بنیاد پر حکومت ایک منصوبہ بندی کرے گی جس میں یہ طے کیا جائے گا کہ معاشرے کی کن ضروریات کو مقدم رکھا جائے؟ کونسی چیز کس مقدار میں پیدا کی جائے؟ اور مختلف وسائل کو کس ترتیب کے ساتھ کن کن کاموں میں لگایا جائے۔ گویا ترجیحات کا تعین' وسائل کی تخصیصات اور ترقی کے تینوں کام حکومت کی منصوبہ بندی کے تحت انجام پائیں۔ رہا آمدنی کی تقسیم کا سوال! سو اشتراکیت نے دعویٰ یہ کیا کہ حقیقتاً عامل پیداوار صرف دو چیزیں ہیں۔ زمین اور محنت' زمین چونکہ انفرادی ملکیت نہیں بلکہ اجتماعی

ملکیت میں ہے لہٰذا اس پر لگا بندھا کرایہ یا لگان دینے کی ضرورت نہیں' اب صرف محنت رہ جاتی ہے۔ اس کی اجرت کا تعین بھی حکومت اپنی منصوبہ بندی کے تحت یہ بات مدنظر رکھتے ہوئے کرے گی کہ مزدوروں کو ان کی محنت کا مناسب صلہ ملے۔

جس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے مذکورہ چاروں بنیادی مسائل کو صرف ذاتی منافع کے محرک اور بازار کی قوتوں کی بنیادوں پر حل کرنا چاہا تھا۔ اسی طرح اشتراکیت نے ان چاروں مسائل کے حل کے لئے ایک ہی بنیادی حل تجویز کیا۔ یعنی منصوبہ بندی۔ اسی لئے اشتراکی معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کہا جاتا ہے۔ جس کا عربی ترجمہ "اقتصاد موجهة" یا "اقتصاد مخطط" کیا گیا ہے۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول

اشتراکیت کے مذکورہ بالا فلسفے کے نتیجے میں اشتراکی معیشت میں مندرجہ ذیل بنیادی اصول کارفرما ہوتے ہیں۔

(۱) اجتماعی ملکیت (Collective Property)

اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ وسائل پیداوار یعنی زمینیں اور کارخانے وغیرہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہوں گے بلکہ وہ قومی ملکیت میں ہوں گے اور حکومت کے زیر انتظام چلائے جائیں گے۔ ذاتی استعمال کی اشیاء ذاتی ملکیت میں ہو سکتی ہیں لیکن وسائل پیداوار پر کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹھیٹ اشتراکی ممالک میں نہ صرف زمینیں اور کارخانے' بلکہ تجارتی دوکانیں بھی کسی فرد واحد کی ملکیت میں نہیں ہوتیں۔ ان میں کام کرنے والے افراد سب حکومت کے ملازم ہوتے ہیں اور حاصل ہونے والی آمدنی تمام تر سرکاری خزانے میں جاتی ہے اور کام کرنے والے ملازمین کو تنخواہ یا اجرت حکومت کی منصوبہ بندی کے تحت دی جاتی ہے۔

(۲) منصوبہ بندی (Planning)

اشتراکی نظام کا دوسرا بنیادی اصول منصوبہ بندی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام بنیادی معاشی فیصلے حکومت منصوبہ بندی کے تحت انجام دیتی ہے۔ اس منصوبہ بندی میں تمام معاشی ضروریات اور تمام معاشی وسائل کے اعداد و شمار جمع کئے جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کونسے وسائل کس چیز کی پیداوار میں لگائے جائیں؟ اور کونسی چیز کس مقدار میں پیدا کی جائے؟ اور نیز کس شعبے میں محنت کرنے والوں کی کیا اجرت مقرر کی جائے؟

حکومت کی طرف سے معیشت کی منصوبہ بندی کا تصور اصلاً تو اشتراکیت نے پیش کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ سرمایہ دار ملکوں نے بھی جزوی طور پر منصوبہ بندی اختیار کرنی شروع کر دی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار ممالک رفتہ رفتہ اپنے اس اصول پر مکمل طور پر قائم نہ رہ سکے کہ حکومت معیشت کے کاروبار میں بالکل مداخلت نہ کرے بلکہ مختلف اجتماعی مقاصد کے تحت سرمایہ دار حکومتوں کو بھی تجارت و معیشت میں کچھ نہ کچھ مداخلت کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ مخلوط معیشت (Mixed Economy) کے نام سے ایک نئی اصطلاح وجود میں آئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر معیشت کو بازار کی قوتوں کے تحت ہی چلایا جائے لیکن ضرورت کے تحت تجارت و صنعت کے بعض شعبے خود سرکاری تحویل میں بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے بعض سرمایہ دار ملکوں میں ریلوے، بجلی، ٹیلیفون، اور فضائی سروس وغیرہ سرکاری تحویل میں ہوتی ہے اور جو تجارتیں نجی طور پر چلائی جا رہی ہیں حکومت ان کو بھی کچھ قواعد اور ضوابط کا پابند بنا دیتی ہے۔ پہلی قسم کی تجارتوں کو سرکاری شعبہ (Public Sector) اور دوسری قسم کو نجی شعبہ (Private Sector) کہا جاتا ہے۔ اب اس مخلوط معیشت میں چونکہ حکومت کی فی الجملہ مداخلت ہوتی ہے۔ اس لئے جزوی طور پر اسے منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے۔ اس جزوی منصوبہ بندی کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے عموماً پنج سالہ منصوبے تیار کئے جاتے ہیں لیکن یہ جزوی منصوبہ بندیاں ہیں جبکہ اشتراکیت کی منصوبہ بندی کلی منصوبہ بندی ہے۔ یعنی اس میں ہر معاشی فیصلہ اس سرکاری منصوبہ بندی کا تابع ہوتا ہے۔

(۳) اجتماعی مفاد (Collective Interest)

اشتراکیت کا تیسرا اصول اجتماعی مفاد ہے۔ یعنی اشتراکیت کا دعویٰ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ساری معاشی سرگرمیاں افراد کے ذاتی مفاد کے تابع ہوتی ہیں لیکن اشتراکی نظام میں منصوبہ بندی کے تحت اجتماعی مفاد کو بنیادی طور پر مدنظر رکھا جاتا ہے۔

(۴) آمدنی کی منصفانہ تقسیم (Equitable Distribution of Income)

اشتراکیت کا چوتھا اصول یہ ہے کہ پیداوار سے جو کچھ آمدنی حاصل ہو وہ افراد کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم ہو۔ اور غریب و امیر کے درمیان زیادہ فاصلے نہ ہوں، آمدنیوں میں توازن ہو۔ شروع میں دعویٰ یہ کیا گیا تھا کہ اشتراکیت میں آمدنی کی مساوات ہوگی۔ یعنی سب کی آمدنی برابر ہوگی۔ لیکن عملاً ایسا کبھی نہیں ہوا، لوگوں کی اجرتیں اور تنخواہیں کم زیادہ ہوتی رہیں۔ البتہ اشتراکیت میں کم سے کم یہ دعویٰ ضرور کیا گیا ہے کہ اس نظام میں تنخواہوں اور اجرتوں کے درمیان تفاوت بہت زیادہ نہیں ہے۔

دونوں نظاموں پر تبصرہ

اشتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان ایک صدی سے زیادہ مدت تک شدید معرکہ آرائی رہی۔ فکری سطح پر دونوں کے درمیان بحث و مناظرہ کا بازار بھی گرم رہا اور سیاسی سطح پر جنگ و پیکار کا بھی۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے پر جو تنقیدیں ہوتی رہی ہیں اور اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک پورا کتب خانہ بھر سکتا ہے۔ یہاں ان تمام تنقیدوں کو پیش کرنا تو ممکن نہیں لیکن اختصار کے ساتھ دونوں نظاموں پر اصولی تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ جو میں یہاں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اشتراکی نظام پر تبصرہ

پہلے اشتراکیت پر تبصرہ کرنا اس لحاظ سے مناسب ہے کہ اس کی خرابیوں کو سمجھنا نسبتاً آسان ہے۔ اشتراکیت کی اتنی بات تو واقعی درست تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کو اتنی کھلی چھوٹ دیدی گئی کہ اسکے نتیجے میں فلاح عامہ کا تصور یا تو بالکل باقی نہیں رہا یا بہت پیچھے چلا گیا۔ لیکن اس کا جو حل اشتراکیت نے تجویز کیا وہ بذات خود بہت انتہاء پسندانہ تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کو اتنا آزاد اور بے لگام چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے منافع کے خاطر جو چاہے کرتا پھرے، اس کے مقابلے میں اشتراکیت نے فرد کو اتنا گھونٹ دیا کہ اس کی فطری آزادی بھی سلب ہو کر رہ گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے بازار کی قوتوں یعنی رسد و طلب کو تمام مسائل کا حل قرار دیا، لیکن اشتراکیت نے ان قدرتی قوانین کو تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ سرکار کی طرف سے کی ہوئی منصوبہ بندی کو ہر مرض کا علاج قرار دیا۔ حالانکہ انسان کی اپنی وضع کی ہوئی منصوبہ بندی ہر جگہ کام نہیں دیتی اور بہت سے مقامات پر اس کا نتیجہ ایک مصنوعی جکڑبند کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔

انسان کو اپنی زندگی میں بہت سے معاشرتی مسائل پیش آتے ہیں۔ ان سب مسائل کو پلاننگ کی بنیاد پر حل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک معاشرتی مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہر مرد کو شادی کے لئے مناسب بیوی درکار ہے اور عورت کو مناسب شوہر، یہ معاشرتی مسئلہ ابتدائے آفرینش سے آج تک لوگوں کی ذاتی پسند ناپسند اور لوگوں کے ذاتی فیصلوں کی بنیاد پر طے ہوتا رہا ہے۔ ہر شخص اپنے لئے مناسب رفیق حیات تلاش کرتا ہے اور جس پر دونوں کا اتفاق ہو جائے شادی عمل میں آجاتی ہے۔ اس نظام کے نتیجے میں بیشک بعض خرابیاں

سامنے آئیں۔ مثلاً یہ ذاتی فیصلہ بعض اوقات غلط بھی ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں ناچاقی اور نااتفاقی پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عورت یا کوئی مرد اس لئے نکاح سے محروم رہ جاتا ہے کہ اس کی طرف کسی کو کوئی کشش نہیں ہوتی' لیکن ان خرابیوں کا یہ علاج آج تک کسی نے نہیں سوچا کہ شادیوں کے نظام کو ذاتی پسند اور ناپسند کے بجائے سرکار کے حوالے کر دینا چاہئے۔ وہی منصوبہ بندی کرے کہ کتنے مرد اور کتنی عورتیں ہیں اور کونسا مرد کس عورت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ اگر کوئی حکومت یا ریاست اس قسم کی کوئی منصوبہ بندی کرنا چاہے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر فطری اور مصنوعی نظام ہو گا۔ جس سے بھی خوش گوار نتائج بر آمد نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح یہ مسئلہ کہ انسان کونسا پیشہ اختیار کرے؟ پیدائش کے کس عمل میں کتنا حصہ لے؟ یا کس انداز سے اپنی خدمات معاشرے کو پیش کرے؟ درحقیقت ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو اگر صرف خشک منصوبہ بندی کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی۔

(۱) منصوبہ بندی کا کام ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام میں حکومت انجام دیتی ہے اور حکومت فرشتوں کے کسی گروہ کا نام نہیں' جس سے کوئی غلطی یا بد دیانتی سرزد نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ حکومت کرنے والے بھی گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں وہ اپنی خواہشات اور ذاتی مفادات سے بھی مغلوب ہو سکتے ہیں اور ان کی سوچ میں بھی غلطی کا امکان ہے۔ دوسری طرف جب سارے ملک کے تمام وسائل پیداوار انسانوں کے اس گروہ کے حوالے کر دیئے گئے تو ان کی نیت میں فتور آنے کی صورت میں اس کے نتائج پوری قوم کو بھگتنے پڑیں گے۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام میں ایک چھوٹا سرمایہ دار محدود وسائل پیداوار پر ملکیت حاصل کر کے چند افراد کو ظلم کا نشانہ بنا سکتا ہے تو اشتراکی نظام میں چند برسر اقتدار افراد پورے ملک کے وسائل پر قابض ہو کر اس سے کہیں زیادہ ظلم کر سکتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ بہت سارے چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو جائیں اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آجائے جو دولت کے سارے وسائل کو من مانے طریقے سے استعمال کرے۔

(۲) اشتراکیت کا منصوبہ بند نظام ایک انتہائی طاقت ور بلکہ جابر حکومت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ چل سکتا ہے۔ کیونکہ افراد کو ہمہ گیر ریاست کی منصوبہ بندی کے تابع بنانے کے لئے ریاستی جبر لازم ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے بجائے ریاستی منصوبہ بندی کے تحت کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ منصوبہ بندی ایک زبردست قوت قاہرہ کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اشتراکی نظام میں سیاسی آزادیوں کا

خاتمہ لازمی ہے اور اس طرح فرد کی آزادی بہرطور کچلی جاتی ہے۔

(۳) چونکہ اشتراکیت میں ذاتی منافع کے محرک کا بالکل خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے لوگوں کی کارکردگی پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ خواہ چستی اور محنت اور اپج کے ساتھ کام کرے یا سستی اور کاہلی کے ساتھ، دونوں صورتوں میں اس کی آمدنی یکساں ہے۔ اس لئے اس میں بہتر کارکردگی کا ذاتی جذبہ برقرار نہیں رہتا۔ ذاتی منافع کا محرک علی الاطلاق بری چیز نہیں۔ بلکہ اگر وہ اپنی حد میں ہو تو انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے اور اسے تت نئی مہم جوئی پر آمادہ کرتا ہے۔ اس فطری جذبے کو حد میں رکھنے کے لئے لگام دینے کی بیشک ضرورت ہے لیکن اسکو بالکلیہ کچل دینے سے انسان کی بہت سی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

یہ تمام خرابیاں محض نظریاتی نوعیت کی نہیں ہیں، بلکہ اشتراکیت کی پہلی تجربہ گاہ روس میں چوہتر سال کے تجربے نے یہ تمام خرابیاں پوری طرح ثابت کر دی ہیں۔ ایک زمانے میں ابھی کچھ عرصہ پہلے تک اشتراکیت اور نیشنلائزیشن کا طوطی بولتا تھا اور جو شخص اس کے خلاف زبان کھولتا اسے رجعت پسند اور سرمایہ دار کا ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ لیکن سوویت یونین کے خاتمے کے موقع پر خود روس کے صدر یلسن نے کہا کہ:

"کاش اشتراکیت (UTOPIAN) [1] نظریے کا تجربہ روس جیسے عظیم ملک میں کرنے کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے رقبے میں کر لیا گیا ہوتا تاکہ اس کی تباہ کاریوں کو جاننے کے لئے چوہتر سال نہ لگتے" (نوز ویک)

سرمایہ دارانہ نظام پر تبصرہ

اب مختصراً سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے پر تبصرہ کرتا ہے۔ اشتراکیت کی ناکامی کے بعد سرمایہ دار مغربی ممالک میں بڑے شد و مد کے ساتھ بغلیں بجائی جارہی ہیں اور یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ چونکہ اشتراکیت عمل کی دنیا میں ناکام ہو گئی۔ اس لئے سرمایہ دارانہ نظام کی

---

[1] UTOPIA کا ترجمہ "لاامکان" ہے اور یہ درحقیقت ایک کتاب کا نام تھا۔ جو قدیم زمانے کے کسی لاطینی یا یونانی بادشاہ نے لکھی تھی۔ جس میں ایک خیالی ریاست کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ جہاں تمام اشیاء انسانوں کی مشترک ملکیت ہیں۔ ہر شخص جو چیز چاہتا ہے اپنی خواہش کے مطابق قیمت دیئے بغیر حاصل کر لیتا ہے۔ اور کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ چونکہ ایک ناممکن العمل تصور تھا، اس لئے یہ لفظ ایک خیالی جنت کے معنی میں استعمال ہونے لگا، جس کے حاصل کرنے کا کوئی امکان نہ ہو اور جو کوئی شخص اس دھن کے خیالی منصوبے بنائے اسکو UTOPIAN کہا جاتا ہے۔

حقانیت ثابت ہوگئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اشتراکیت کی ناکامی کی وجہ یہ نہیں تھی کی مروجہ سرمایہ دارانہ نظام برحق تھا' بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشتراکیت نے سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقی غلطیوں کی اصلاح کے بجائے ایک دوسرا غلط راستہ اختیار کرلیا' لہٰذا اب سرمایہ دارانہ نظام کی فکری غلطیوں کو زیادہ باریک بینی کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی فلسفے میں اس حد تک تو بات درست تھی کہ معاشی مسائل کے حل کے لئے ذاتی منافع کے محرک اور بازار کی قوتوں یعنی رسد وطلب سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ لیکن غلطی درحقیقت یہاں سے لگی کہ ایک فرد کو زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کی بے لگام آزادی دی گئی' جس میں حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں تھی اور نہ اجتماعی فلاح کی طرف خاطر خواہ توجہ تھی۔ چنانچہ اس کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنا بھی جائز ہوگیا جن کے نتیجے میں وہ زیادہ سے زیادہ دولت مند بن کر بازار پر اپنی اجارہ داری (Monopoly) قائم کرلے۔ اجارہ داری کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص چیز کی رسد فراہم کرنا کسی ایک شخص یا ایک گروپ میں منحصر ہو کر رہ جائے۔ یعنی صورت حال ایسی پیدا ہوجائے کہ اس شخص یا گروپ کے سوا کوئی اور وہ چیز پیدا نہ کرپائے۔ اس اجارہ داری کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ وہ چیز اس کی مقرر کی ہوئی من مانی قیمت پر لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

انسان کے ذاتی منافع کے محرک کو مکمل چھوٹ دینے اور اس پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے نتیجے میں جو خرابیاں سرمایہ دار معاشرے میں پیدا ہوئیں' وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:

(۱) چونکہ منافع کے حصول کے لئے حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ اس لئے اس سے بہت سی اخلاقی برائیاں معاشرے میں پھیلیں۔ اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کا محرک اکثر لوگوں کے سفلی جذبات کو اپیل کر کے ان کی غلط خواہشات کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ جس سے معاشرے میں اخلاقی بگاڑ پھیلتا ہے۔ چنانچہ مغربی ممالک میں عریانی اور فحاشی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔ عریاں تصاویر اور فلموں کا ایک سیلاب ہے' جسے معاشرے میں پھیلا کر لوگ ذاتی منافع کے محرک کی تسکین کررہے ہیں۔ عورتیں اپنے جسم کا ایک ایک عضو اس محرک کے تحت بازار میں فروخت کررہی ہیں۔ ابھی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق سروسز کے کاروبار میں سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار ماڈل گرلز کا ہے' جو اپنی تصویریں صنعت کاروں کو اپنی مصنوعات پر چھاپنے کے لئے یا اشتہار کا حصہ بنانے کے لئے فراہم کرتی ہیں' اور اس کا بہت بھاری معاوضہ وصول کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا طبقہ امریکہ کے سب سے زیادہ کمانے والوں میں شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان

پر جو لاکھوں ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں وہ بالآخر پیداوار کی لاگت میں شامل ہو کر عام صارفین کی جیب پر پڑتے ہیں' اور اس طرح پوری قوم ان بد اخلاقیوں کی مالی قیمت بھی ادا کرتی ہے۔

(۲) چونکہ ذاتی منافع کے حصول پر کوئی خاص اخلاقی پابندی عائد نہیں' اس لئے ترجیحات کے تعین اور وسائل کی تخصیص میں اجتماعی مصالح کا کماحقہ لحاظ نہیں ہوپاتا' جب زیادہ منافع کا حصول ہی منتہاء مقصود ٹھہرا تو اگر یہ زیادہ منافع عریاں فلموں کے ذریعے حاصل ہو رہا ہو تو ایک شخص بے گھر لوگوں کو مکان فراہم کرنے میں روپیہ کیوں لگائے؟ جبکہ مقابلتاً اس میں نفع کم ہو۔

(۳) ذاتی منافع کے محرک پر حلال و حرام کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے سود' قمار' سٹہ وغیرہ سب سرمایہ دارانہ نظام میں جائز ہیں' حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جو معیشت کے فطری توازن میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔ جس کا ایک مظاہرہ یہ ہے کہ ان کے نتیجے میں بکثرت اجارہ داریاں قائم ہو جاتی ہیں۔ اور ان اجارہ داریوں کی موجودگی میں بازار کی فطری قوتیں یعنی رسد و طلب کے قوانین مفلوج ہو جاتے ہیں اور کماحقہ کام نہیں کرپاتے' یعنی ایک طرف تو سرمایہ دارانہ نظام کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم مارکیٹ کی قوتوں یعنی رسد و طلب سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ذاتی منافع کے محرک کو بے مہار چھوڑ کر اس میں اجارہ داریوں کے مواقع فراہم کئے گئے ہیں' جن سے رسد و طلب کی قوتیں ناکارہ یا بے اثر ہو جاتی ہیں۔

اسکی تھوڑی سی تشریح یہ ہے کہ رسد و طلب کی قوتیں معیشت میں توازن پیدا کرنے کے لئے اس وقت کارآمد ہوتی ہیں جب بازار میں آزاد مقابلے (Free competition) کی فضا ہو' لیکن جب کسی شخص کی اجارہ داری قائم ہو جائے تو قیمتوں کا نظام متوازن نہیں رہتا اور معیشت کے چار بنیادی مسائل کے بارے میں ہونے والے فیصلے معاشرے کی حقیقی ضرورت اور طلب کی عکاسی نہیں کرتی' اور یہاں بھی ایک مصنوعی نظام وجود میں آجاتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں' مثلاً چینی کی پیداوار ضرورت کے مطابق اتنی ہونی چاہئے کہ بازار میں اسکی مناسب قیمت رسد و طلب کے ذریعہ متعین ہو جائے' لیکن مناسب قیمت پہ تعین اسی وقت ممکن ہے جب چینی بنانے کے لئے مختلف کارخانے موجود ہوں' اور خریدنے والے کو یہ اختیار ہو کہ اگر ایک کارخانے کی چینی مہنگی ہے تو وہ دوسرے کارخانے سے خرید سکے۔ اگر بازار میں یہ مقابلے کی فضا ہو تو کوئی بھی کارخانہ قیمت کے تعین میں من مانی نہیں کر سکتا' اس صورت میں بازار میں چینی کی جو قیمت متعین ہوگی وہ واقعتاً طلب و رسد کے توازن سے وجود میں آئے گی اور متوازن قیمت

ہوگی۔ لیکن اگر ایک ہی شخص چینی کے کاروبار کا اجارہ دار بن گیا اور لوگ صرف اسی سے چینی خریدنے پر مجبور ہیں تو پھر لوگوں کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ اس کی مقرر کی ہوئی قیمت پر چینی خریدیں۔ ایسی صورت میں چینی کی جو قیمت ہوگی وہ یقیناً اس صورت سے زیادہ ہوگی جب بازار میں ایک سے زیادہ چینی فراہم کرنے والے ہوتے' اور ان میں تجارتی مقابلہ ہوتا۔ فرض کیجئے کہ آزاد مقابلے کی صورت میں چینی کی قیمت ۸ روپے کلو ہوتی' تو اجارہ داری کی صورت میں وہ دس یا بارہ روپے کلو ہو سکتی ہے۔ اب اگر لوگ بارہ روپے میں چینی خرید رہے ہیں تو یہ معاملہ ان کی حقیقی طلب کی نمائندگی نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک مصنوعی صورت حال کی نمائندگی کر رہا ہے جو چینی کے ایک تاجر کی اجارہ داری سے پیدا ہوئی اور اس طرح اجارہ داری نے حقیقی طلب و رسد کے نظام کو بگاڑ دیا۔

لہٰذا اگرچہ یہ کتنا درست تھا کہ معاشی مسائل کا فیصلہ بڑی حد تک طلب و رسد کی طاقتوں کو کرنا چاہئے لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے جب ذاتی منافع کے محرک کو حلال و حرام کی تفریق کے بغیر بے مہار چھوڑ دیا گیا تو اس نے اجارہ داریاں قائم کر کے خود طلب و رسد کی قوتوں کو ٹھیک ٹھیک کام کرنے سے روک دیا۔ اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے ایک اصول نے عملاً خود اپنے دوسرے اصول کی نفی کر دی۔

(۴) اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام کا اصل تصور یہ تھا کہ کاروبار اور تجارت میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ تجربات سے گزرنے کے بعد عملاً یہ اصول پوری طرح برقرار نہیں رہ سکا۔ تقریباً تمام سرمایہ دارانہ ممالک میں حکومت کی طرف سے کچھ نہ کچھ مداخلت ہوتی رہی ہے۔ مثلاً حکومت مختلف قوانین کے ذریعہ بالخصوص ٹیکسوں کے ذریعہ کسی تجارت کی ہمت افزائی اور کسی کی ہمت شکنی کرتی رہی ہے اور اب شاید کوئی سرمایہ دار ملک ایسا نہیں ہے جس میں کاروبار اور تجارت پر حکومت کی طرف سے کوئی نہ کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ لہٰذا حکومت کی عدم مداخلت (Laissez Faire) کے اصول پر صحیح طور سے عمل کرنے والا دنیا میں کوئی ملک موجود نہیں۔ لیکن حکومت کی یہ مداخلتیں بسا اوقات تو نوکر شاہی اور سرمایہ داروں کے باہمی گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جن کا فائدہ صرف بااثر سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے اور اس کی وجہ سے اجتماعی فلاح و بہبود حاصل نہیں ہوتی اور اگر یہ پابندیاں اس قسم کے گٹھ جوڑ اور بددیانتی سے خالی ہوں تب بھی وہ خالص سیکولر سوچ پر مبنی ہوتی ہیں۔ اپنی عقل کی روشنی میں جو پابندی مناسب سمجھی لگا دی۔ حالانکہ تنہا عقل تمام انسانی مسائل حل کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پابندیاں معاشی ناہمواریوں کا صحیح علاج نہیں بن سکیں۔

(۵) سرمایہ دارانہ نظام میں خاص طور پر تقسیم دولت کا نظام ناہمواری کا شکار

رہتا ہے۔ اس ناہمواری کا ایک بڑا سبب سود اور قمار ہے، اس کے نتیجے میں دولت کے بہاؤ کا رخ امیروں کی طرف رہتا ہے، غریبوں اور عوام کی طرف نہیں ہوتا۔ اس کی پوری تشریح انشاء اللہ تقسیم دولت پر گفتگو کرتے ہوئے آئے گی۔

معیشت کے اسلامی احکام

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مختصر تعارف کے بعد اب میں مختصراً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ معیشت کے جو چار بنیادی مسائل بیان کئے گئے تھے، ان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟ یہ بات پہلے ہی قدم پر واضح رہنی چاہئے کہ اسلام کوئی معاشی نظام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دین ہے، جس کے احکام ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ہیں۔ جس میں معیشت بھی داخل ہے۔ لہٰذا قرآن و حدیث نے معروف معنوں میں کوئی معاشی فلسفہ یا نظریہ پیش نہیں کیا، جس کو موجودہ دور کی معاشی اصطلاحات میں تعبیر کیا گیا ہو۔ لہٰذا ترجیحات کا تعین، وسائل کی تخصیص، آمدنی کی تقسیم، اور ترقی کے عنوان سے قرآن و سنت یا اسلامی فقہ میں براہ راست کوئی بحث موجود نہیں ہے لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اسلام نے معیشت کے بارے میں بھی کچھ احکام دیئے ہیں۔ ان احکام کے مجموعی مطالعے سے ہم یہ مستنبط کر سکتے ہیں کہ مذکورہ چار مسائل کے سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور اسی مطالعے اور استنباط کا حاصل اس وقت پیش کرنا مقصود ہے۔

اسلام کے معاشی احکام اور تعلیمات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں یعنی رسد و طلب کے قوانین کو تسلیم کیا ہے اور وہ معیشت کے مسائل کے حل کے لئے ان کے استعمال کا فی الجملہ حامی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

> نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیاۃ و رفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا (زخرف : ۳۲)
>
> ہم نے ان کے درمیان معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات میں فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔

ظاہر ہے کہ ایک دوسرے سے کام اس طرح لیا جائے گا کہ کام لینے والا کام کی طلب اور کام دینے والا کام کی رسد ہے۔ اس طلب و رسد کی باہمی کشمکش اور باہمی امتزاج سے ایک متوازن معیشت وجود میں آتی ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب دیہاتی اپنی زرعی پیداوار شہر میں فروخت کرنے کے لئے لاتا تو بعض شہری لوگ اس دیہاتی سے کہتے کہ تم اپنا مال خود لیجا کر شہر میں مت بیچو، بلکہ یہ سامان مجھے دیدو، میں

مناسب وقت پر اس کو فروخت کروں گا' تاکہ اس کی قیمت زیادہ ملے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہریوں کو ایسا کرنے سے روکا' اور اس کے ساتھ ہی یہ جملہ ارشاد فرمایا:

"دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم عن بعض
لوگوں کو آزاد چھوڑ دو تاکہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرمائے"

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیچنے اور خریدنے والے کے درمیان تیسرے شخص کی مداخلت کو اس لئے مسترد فرمادیا تاکہ بازار میں طلب و رسد کا صحیح توازن قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ دیہاتی جب براہ راست بازار میں کوئی چیز فروخت کرے گا تو اپنا مناسب نفع رکھ کر ہی فروخت کرے گا۔ لیکن اسے چونکہ جلدی واپس جانا ہے' اس لئے اس کے پاس ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نہیں اور خود اس کے بازار میں پہنچنے کی صورت میں طلب و رسد کا ایسا امتزاج ہو گا جو صحیح قیمت متعین کرنے میں مدد دے گا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی تیسرا آدمی ان دونوں کے درمیان آجائے اور مال کی ذخیرہ اندوزی کر کے اس کی مصنوعی قلت پیدا کرے تو وہ طلب و رسد کے قدرتی نظام میں بگاڑ پیدا کرے گا۔ لہٰذا اس حدیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب و رسد کے قدرتی نظام کو تسلیم فرمایا اور اسکو باقی رکھنے کی کوشش فرمائی۔

اسی طرح جب آپ سے یہ درخواست کی گئی کہ آپ بازار میں فروخت ہونے والی اشیاء کی قیمتیں سرکاری طور پر متعین فرمادیں تو اس موقع پر بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

ان اللہ ھو المسعر القابض الباسط الرازق
"بیشک اللہ تعالیٰ ہی قیمت متعین کرنے والے ہیں۔ وہی چیزوں کی رسد میں کمی کرنے والے اور زیادتی کرنے والے ہیں اور وہی رازق ہیں"

اللہ تعالیٰ کو قیمت مقرر کرنے والا قرار دینے کا واضح مطلب اس حدیث کے سیاق میں یہ بھی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے طلب و رسد کے فطری اصول مقرر فرمائے ہیں جن سے قیمتیں فطری طور پر متعین ہوتی ہیں اور اس فطری نظام کو چھوڑ کر مصنوعی طور سے قیمتوں کا تعین پسندیدہ نہیں۔

قرآن وسنت کے ان ارشادات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں یعنی طلب و رسد کے قوانین کو فی الجملہ تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح ذاتی منافع کے محرک سے بھی فی الجملہ کام لیا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں اس محرک کو

بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا' جسکے نتیجے میں وہ خرابیاں پیدا ہوئیں جن کا ذکر پیچھے کیا گیا۔ اسلام نے ذاتی منافع کے محرک کو برقرار رکھتے ہوئے اور رسد وطلب کے قوانین کو تسلیم کرتے ہوئے تجارتی اور معاشی سرگرمیوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دیں کہ ان پر عمل کی صورت میں ذاتی منافع کا محرک ایسے غلط رخ پر نہیں چل سکتا جو معیشت کو غیر متوازن کرے یا اس سے دوسری اخلاقی یا اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں۔ اسلام نے ذاتی منافع کے محرک پر جو پابندیاں عائد کی ہیں' انہیں تین قسموں پر منقسم کیا جا سکتا ہے:

(۱) خدائی پابندی

سب سے پہلے تو اسلام نے معاشی سرگرمیوں پر حلال وحرام کی کچھ ایسی ابدی پابندیاں عائد کی ہیں جو ہر زمانے میں اور ہر جگہ نافذ العمل ہیں۔ مثلاً سود' قمار' سٹہ' اکتناز' احتکار' یعنی ذخیرہ اندوزی اور دوسری تمام بیوع باطلہ کو کلی طور پر ناجائز قرار دیدیا' کیونکہ یہ چیزیں عموماً اجارہ داریوں کے قیام کا ذریعہ بنتی ہیں اور ان سے معیشت میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان تمام چیزوں کی پیداوار اور خرید وفروخت کو حرام قرار دیا جن سے معاشرہ کسی بداخلاقی کا شکار ہو' اور جس میں لوگوں کے سفلی جذبات بھڑکا کر ناجائز طریقے سے آمدنی حاصل کرنے کا راستہ پیدا کیا جائے۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ یہ خدائی پابندیاں قرآن وسنت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں۔ انہیں اسلام نے انسان کی ذاتی عقل پر نہیں چھوڑا کہ اگر اس کی عقل مناسب سمجھے تو یہ پابندی عائد کر دے اور اگر مناسب نہ سمجھے تو عائد نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرنے کے لئے بسا اوقات انسانوں کی عقلوں میں تفاوت اور اختلاف ہوتا ہے۔ ایک انسان کی عقل ایک چیز کو اچھا اور دوسرے انسان کی عقل اس کو برا سمجھ سکتی ہے' لہٰذا اگر ان پابندیوں کو بھی محض عقل انسانی کے حوالے کیا جاتا تو اس بات کا امکان تھا کہ لوگ ان پابندیوں کو اپنی عقل کی روشنی میں نامناسب قرار دیکر معاشرے کو ان سے آزاد کر دیتے اور چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں یہ پابندیاں ہر زمانے اور ہر جگہ کے لئے ضروری تھیں اس لئے ان کو وحی کے ذریعہ ابدی حیثیت دی گئی' تاکہ انسان اپنی عقلی تاویلات کے سہارے ان سے چھٹکارا حاصل کر کے معیشت اور معاشرے کو ناہمواریوں میں مبتلا نہ کر سکے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ خدائی پابندیاں جو قرآن وسنت نے عائد کی ہیں، بہرصورت واجب العمل ہیں۔ خواہ انسان کو ان کی عقلی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا' موجودہ دور میں بیشتر سرمایہ دار ممالک بھی ذاتی منافع

کے محرک پر کچھ نہ کچھ پابندیاں ضرور عائد کرتے ہیں لیکن وہ پابندیاں چونکہ وحی الٰہی سے مستفید نہیں ہوتیں۔ اس لئے وہ متوازن معیشت کے قیام کے لئے کافی نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ان سرمایہ دار ملکوں میں کہیں بھی سود' قمار' اور سٹہ وغیرہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی' جو معاشی ناہمواریوں کا بہت بڑا سبب ہیں۔

۲۔ریاستی پابندیاں

مذکورہ خدائی پابندیاں تو ابدی نوعیت کی تھیں۔ انہی کے ساتھ اسلامی شریعت نے حکومت وقت کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ کسی عمومی مصلحت کے تحت کسی ایسی چیز یا ایسے فعل پر بھی پابندی عائد کر سکتی ہے' جو بذات خود حرام نہیں' بلکہ مباحات کے دائرے میں آتی ہے' لیکن اس سے کوئی اجتماعی خرابی لازم آتی ہے۔ یہ پابندی ابدی نوعیت کی نہیں ہوتی' جو ہر زمانے میں اور ہر جگہ نافذ العمل ہو۔ بلکہ اس کی حیثیت وقتی حکم کی ہوتی ہے' جو وقتی مصلحت کے تابع ہوتا ہے۔ اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جب ہیضہ کی وبا پھوٹ رہی ہو تو حکومت یہ پابندی لگا سکتی ہے کہ خربوزے کی خرید و فروخت اور اسکا کھانا ممنوع ہے۔ جب تک حکومت کی طرف سے عائد کردہ یہ پابندی باقی رہے اس وقت تک خربوزہ کھانا اور اس کا بیچنا شرعاً بھی ناجائز ہو جائے گا۔ اسی طرح اصول فقہ میں "سدِّ ذرائع" کے نام سے ایک مستقل باب ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک کام فی نفسہ جائز ہو لیکن اس کی کثرت کسی معصیت یا مفسدے کا سبب بن رہی ہو تو حکومت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اس جائز کام کو بھی ممنوع قرار دیدے۔

اس اصول کے تحت حکومت تمام معاشی سرگرمیوں کی نگرانی کر سکتی ہے اور جن سرگرمیوں سے معیشت میں ناہمواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو' ان پر مناسب پابندی عائد کر سکتی ہے۔ کنز العمال میں روایت منقول ہے کہ حضرت فاروق اعظم ﷺ ایک مرتبہ بازار میں آئے تو دیکھا کہ ایک شخص کوئی چیز اس کے معروف نرخ سے بہت کم داموں میں فروخت کر رہا ہے آپ نے اس سے فرمایا کہ :

اما ان تزید فی السعر و اما ترفع عن سوقنا

یا تو دام میں اضافہ کرو' ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ'

روایت میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کس وجہ سے اس پر پابندی لگائی۔ ہو سکتا ہے کہ وجہ یہ ہو کہ وہ متوازن قیمت سے بہت کم قیمت لگا کر دوسرے تاجروں کے لئے جائز نفع کا راستہ بند کر رہا ہو' اور یہ بھی ممکن ہے کہ پابندی کی وجہ یہ ہو کہ کم قیمت پر مہیا ہونے کی صورت میں لوگ اسے ضرورت سے زیادہ خرید رہے ہوں، جس سے اسراف کا دروازہ کھلتا ہو' یا لوگوں کے لئے ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نکلتی

ہو۔بہر صورت قابل غور بات یہ ہے کہ اصل شرعی حکم یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ملکیت کی چیز جس دام پر چاہے فروخت کر سکتا ہے۔ لہٰذا کم قیمت پر بیچنا فی نفسہ جائز تھا' لیکن کسی اجتماعی مصلحت کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر پابندی عائد کی۔

اس قسم کی ریاستی پابندیوں کے واجب التعمیل ہونے کا مآخذ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

"یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم"

اے ایمان والو' اللہ کی اطاعت کرو' اور رسول کی اور اپنے میں سے بااختیار لوگوں کی اطاعت کرو۔

اس آیت میں "اولی الامر" (بااختیار افراد) کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت سے الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جن چیزوں میں قرآن و سنت نے کوئی معین حکم نہیں دیا ان میں اولی الامر کے احکام واجب التعمیل ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہنا ضروری ہے کہ حکومت کو مباحات پر پابندی عائد کرنے کا یہ اختیار غیر محدود نہیں ہے بلکہ اس کے بھی کچھ اصول و ضوابط ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، لیکن دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت کا وہی حکم واجب التعمیل ہے جو قرآن و سنت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو اور دوسرے یہ کہ حکومت کو اس قسم کی پابندی عائد کرنے کا اختیار صرف اس وقت ملتا ہے جب کوئی اجتماعی مصلحت اسکی داعی ہو۔ چنانچہ ایک مشہور فقہی قاعدے میں اس بات کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ:

تصرف الامام بالرعیۃ منوط بالمصلحۃ

(عوام پر حکومت کے اختیارات مصلحت کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں)

لہٰذا اگر کوئی حکومت کسی اجتماعی مصلحت کے بغیر کوئی پابندی عائد کرے تو یہ پابندی جائز نہیں' اور قاضی کی عدالت سے اسکو منسوخ کرایا جا سکتا ہے۔

۳۔ اخلاقی پابندیاں

جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا کہ اسلام تھیٹ معنوں میں کسی معاشی نظام کا نام نہیں بلکہ ایک دین کا نام ہے۔ اس دین کی تعلیمات اور احکام زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معیشت سے بھی متعلق ضرور ہیں۔ لیکن اس دین کی تعلیمات میں یہ بات قدم قدم پر واضح کی گئی ہے کہ معاشی سرگرمیاں اور ان سے حاصل ہونے والے مادی فوائد انسان کی زندگی کا منتہاء مقصود نہیں ہے۔ قرآن و سنت کا تمام تر زور اس بات پر ہے کہ دنیاوی

زندگی ایک محدود اور چند روزہ زندگی ہے اور اس کے بعد ایک ایسی ابدی زندگی آنے والی ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں' اور انسان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی دنیوی زندگی کو اس آخرت کی زندگی کے لئے زینہ بنائے' اور وہاں کی بہبود کی فکر کرے - لہٰذا انسان کی اصل کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں چار پیسے زیادہ کمالے' بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ آخرت کی ابدی زندگی میں زیادہ سے زیادہ عیش و آرام کا انتظام کرے - جس کا راستہ یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے وہ کام کرے' جو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہو-

جب یہ ذہنیت افراد میں پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے معاشی فیصلوں پر اثر انداز ہونے والی چیز صرف یہ نہیں ہوتی کہ کونسی صورت میں ہماری تجوری زیادہ بھرے گی' بلکہ بسا اوقات ان کے معاشی فیصلے اس بنیاد پر بھی ہوتے ہیں کہ کون سے کام میں مجھے آخرت میں زیادہ فائدہ حاصل ہو گا؟ اس طرح بہت سے معاملات میں شریعت نے کوئی وجوبی حکم (Mandatory Order) تو نہیں دیا- لیکن کسی خاص بات کے اخروی فضائل بیان فرمائے ہیں - جو ایک مومن کے لئے بہت بڑی کشش کا ذریعہ ہیں - اور ان کے توسط سے انسان خود اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عائد کر لیتا ہے - اخلاقی پابندیوں سے میری مراد اسی قسم کی پابندیاں ہیں -

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس سرمایہ کاری کے لئے دو راستے ہیں - ایک یہ کہ وہ اپنا سرمایہ کسی جائز تفریحی مگر تجارتی منصوبے میں لگائے' جس میں اسے زیادہ آمدنی کی توقع ہے - اور دوسرا یہ کہ وہ یہ سرمایہ بے گھر لوگوں کے لئے سستے مکان تعمیر کر کے فروخت کرنے پر صرف کرے - جس میں اسے نسبتاً کم منافع کی توقع ہے' تو ایک سیکولر ذہنیت کا حامل شخص یقیناً پہلے راستے کو اختیار کرے گا - کیونکہ اس میں منافع زیادہ ہے - لیکن جس شخص کے دل میں آخرت کی فکر بسی ہوئی ہو' وہ اس کے برعکس یہ سوچے گا کہ اگرچہ رہائشی منصوبہ میں مالی نفع نسبتاً کم ہے' لیکن میں غریب لوگوں کے لئے رہائشی مکان فراہم کر کے اپنے لئے آخرت میں اجر و ثواب زیادہ حاصل کر سکتا ہوں - اس لئے مجھے تفریحی منصوبے کے بجائے رہائشی منصوبے کو اختیار کرنا چاہئے -

یہاں اگرچہ دونوں راستے شرعی اعتبار سے جائز تھے' اور ان میں سے کسی پر کوئی ریاستی پابندی بھی عائد نہیں تھی - لیکن عقیدۂ آخرت پر مبنی اخلاقی پابندی نے لوگوں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس شخص کے دل میں ایک اندرونی رکاوٹ پیدا کر دی - جس سے ترجیحات کا بہتر تعین اور وسائل کی بہتر تخصیص عمل میں آئی - یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے - لیکن اگر واقعتاً اسلام کا عقیدۂ آخرت دل میں پوری طرح جاگزیں اور مستحضر

ہو تو وہ معاشی فیصلوں کی بہتری میں بہت زبردست کردار ادا کرتا ہے۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ غیر اسلامی معاشروں میں بھی اخلاق کا ایک مقام ہے۔ اور بعض مرتبہ اخلاقی نقطۂ نظر معاشی فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ان اخلاقی تصورات کی پشت پر آخرت کا مضبوط عقیدہ نہیں اس لئے وہ بحیثیت مجموعی معیشت کے اوپر کوئی بہت نمایاں اثرات نہیں چھوڑتا۔ اس کے برخلاف اسلام اپنی تمام تعلیمات کے ساتھ بتمام وکمال نافذ العمل ہو تو اس کی اخلاقی تعلیمات کا اثر معیشت پر بہت نمایاں ہو گا جیسا کہ ماضی میں اس کی بے شمار جیتی جاگتی مثالیں سامنے آچکی ہیں۔ لہٰذا اخلاقی پابندیوں کا یہ عنصر بحیثیت اسلامی معیشت کے تناظر میں کسی بھی طرح کوئی کمزور عنصر نہیں' بلکہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

مختلف نظامہائے معیشت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم

اب تک جو بحث کی گئی' وہ معیشت کے بارے میں بنیادی نظریاتی بحث تھی۔ اب میں مختصراً اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ مختلف نظامہائے معیشت کے جو بنیادی نظریات پیچھے بیان کئے گئے ان پر عمل کرنے کے لئے ہر نظام معیشت کیا طریق کار اختیار کرتا ہے؟ اس طریق کار کو عموماً علم معاشیات میں چار عنوانات کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ پیدائش دولت (Production of Wealth)

اس عنوان کے تحت ان مسائل سے بحث ہوتی ہے جو دولت کی پیداوار سے متعلق ہیں' یعنی یہ بتایا جاتا ہے کہ ہر نظام معیشت کے تحت پیداوار حاصل کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جاتے ہیں؟ اس میں افراد اداروں اور حکومت وغیرہ کا کیا کردار ہوتا ہے؟ اس عنوان کا عربی نام "انتاج الثروہ" ہے۔

۲۔ تقسیم دولت (Distribution of Wealth)

اس عنوان کے تحت اس بات سے بحث ہوتی ہے کہ حاصل شدہ پیداوار کو اس کے مستحقین کے درمیان کس طریق کار کے تحت تقسیم کیا جائے؟ اسکو عربی میں "توزیع الثروہ" کہتے ہیں۔

۳۔ مبادلۂ دولت (Exchange of Wealth)

اس عنوان کے تحت ان طریقوں سے بحث کی جاتی ہے جو لوگ ایک چیز کے بدلے دوسری چیز حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ اس عنوان کو عربی زبان میں "مبادلۃ الثروۃ" کہتے ہیں۔

۴۔ صرفِ دولت (Consumption of Wealth)

اس عنوان کے تحت حاصل شدہ پیداوار یا دولت کو خرچ کرنے سے متعلق مسائل سے بحث ہوتی ہے۔ اسکو عربی میں "استھلاک الثروۃ" کہا جاتا ہے۔

جہاں تک "مبادلۂ دولت" اور "صرفِ دولت" کا تعلق ہے۔ میں فی الحال ان عنوانات کو نظرانداز کرتا ہوں۔ ان سے متعلق بعض اہم مسائل اگلے مباحث کے ضمن میں انشاء اللہ آجائیں گے۔ البتہ پیدائش دولت اور تقسیم دولت کے بارے میں چند بنیادی باتیں اشتراکیت، سرمایہ داری اور اسلام کے تقابلی مطالعے کے لئے ضروری ہیں، ان کو مختصراً بیان کرنا پیش نظر ہے۔

پیدائش اور تقسیم کا سرمایہ دارانہ نظریہ

سرمایہ دارانہ نظام میں یہ بات ایک مسلمہ کے طور پر طے شدہ ہے کہ کسی بھی چیز کی پیداوار میں چار عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ جن کو اردو میں "عوامل پیداوار" اور عربی میں "عوامل الانتاج" اور انگریزی میں (Factors oF Production) کہتے ہیں۔

۱۔ زمین (Land)
اس سے مراد قدرتی عامل پیدائش ہے۔ جو براہ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے، اور اس کے پیدا کرنے میں کسی انسانی عمل کا کوئی دخل نہیں۔

۲۔ محنت (Labour)
اس سے مراد وہ انسانی عمل ہے، جس کے ذریعہ کوئی نئی پیداوار وجود میں آتی ہے۔

۳۔ سرمایہ (Capital)

اسکی تعریف سرمایہ دارانہ نظام میں یہ کی گئی ہے کہ سرمایہ "پیدا کردہ عامل پیدائش" (Produced factor of Production) کا نام ہے۔ اس تعریف کو ذرا وضاحت کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ سرمایہ وہ عامل پیداوار ہے جو قدرتی نہ ہو، بلکہ کسی عمل پیدائش کے نتیجے میں پیدا ہو، اور اس کے بعد کسی اگلے عمل پیدائش میں استعمال ہو رہا ہو۔

۴۔ آجر (Entrepreneur)

اس سے مراد وہ شخص یا ادارہ ہے جو کسی عمل پیدائش کا محرک ہوتا ہے، اور مذکورہ بالا تین عوامل پیداوار کو جمع کر کے انہیں پیدائش کے عمل میں استعمال کرتا ہے اور نفع و نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظریہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں پیدائش کا عمل ان چار عوامل کی مشترک کارروائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات یہ عوامل ایک ہی شخص کی ذات میں بھی جمع ہو جاتے ہیں یعنی وہی زمین فراہم کرتا ہے، وہی محنت کرتا ہے، اور وہی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ لیکن بڑے پیمانے کی صنعتوں میں عموماً یہ چاروں عوامل الگ الگ شخصیتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور چونکہ پیداوار ان کے اشتراک سے عمل میں آتی ہے، لہٰذا حاصل شدہ پیداوار کے مستحق بھی یہی ہیں۔ چنانچہ تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ یہ ہے کہ زمین کو لگان یا کرایہ (Rent) ملنا چاہئے۔ محنت کو اجرت (Wages) سرمایہ کو سود (Interest) اور آجر کو نفع (Profit)۔ ان میں سے تقسیم کی پہلی تین مدات یعنی کرایہ، اجرت اور سود پہلے سے متعین ہوتی ہیں، اور ان کا تعین رسد و طلب کی بنیاد پر ہوتا ہے، جس کی تشریح پیچھے گزر چکی، البتہ تقسیم کی چوتھی مد یعنی منافع، کاروبار شروع کرتے وقت متعین طور سے معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا تعین کاروبار کے نتیجہ خیز ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ یعنی پہلی تین مدات میں دولت تقسیم کرنے کے بعد جو کچھ بچے، وہ آجر کا منافع ہوتا ہے۔

اشتراکی نظام میں پیدائش و تقسیم

اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ حقیقتہً عوامل پیداوار چار نہیں، بلکہ صرف دو ہیں۔ ایک زمین، دوسرے محنت۔ انہی دونوں کے اشتراک سے پیداوار وجود میں آتی ہے، سرمایہ کو اس لئے عامل پیداوار نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود کسی عمل پیدائش کا نتیجہ ہوتا ہے اور آجر کو اس لئے مستقل عامل پیداوار قرار دینے کی ضرورت نہیں کہ اس کا عمل محنت میں داخل ہو سکتا ہے۔ دوسرے خطرہ مول لینے کی صفت کسی شخص یا پرائیویٹ ادارے میں تسلیم کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ یہ کام اشتراکی نظام میں حکومت کرتی ہے۔ افراد کو کاروباری مہم جوئی کی نہ اجازت ہے اور نہ ضرورت۔

چونکہ اشتراکی نظام میں حقیقی عامل پیداوار صرف زمین اور محنت ہیں۔ زمین کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہوتی، اس لئے اس کو الگ سے معاوضہ دینے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا تقسیم دولت کی صرف ایک مد رہ جاتی ہے، اور وہ ہے اجرت، جس کا تعین سرکاری منصوبہ

بندی کے تحت ہوتا ہے۔ کارل مارکس کا مشہور نظریہ ہے کہ کسی چیز کی قدر میں اضافہ صرف محنت سے ہوتا ہے۔ اس لئے اجرت کا استحقاق صرف محنت کو ہے۔ سرمایہ کا سود' زمین کا لگان اور آجر کا نفع ایک فالتو چیز ہے جسے مصنوعی طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کو "قدر زائد کا نظریہ" (Theory oF Surplus Value) کہا جاتا ہے۔ اور اس کا عربی نام "نظرية القدر" ہے۔

اسلامی تعلیمات

قرآن و سنت میں پیدائش دولت اور تقسیم دولت پر اس انداز سے تو گفتگو نہیں کی گئی' جس طرح کسی معاشیات کی کتاب میں کی جاتی ہے' لیکن معیشت کے مختلف ابواب میں قرآن و سنت نے جو احکام عطا فرمائے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام میں سرمایہ (Capital) اور آجر (Entrepreneur) کی تفریق کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کاروبار کے نفع و نقصان کا خطرہ آجر پر ڈالا گیا ہے اور سرمایہ کو معین شرح سے سود دیا جاتا ہے۔ اسلام میں چونکہ سود حرام ہے۔ اس لئے نفع و نقصان کا خطرہ خود سرمائے پر عائد ہوتا ہے' لہٰذا ہر وہ شخص جو کسی کاروبار میں سرمایہ کاری کر رہا ہو' اسے نفع کی امید کی ساتھ نقصان کا خطرہ بھی مول لینا پڑے گا۔ اس طرح یا تو یوں کہا جائے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے اگرچہ سرمایہ اور آجر الگ الگ عاملِ پیدائش ہیں لیکن سرمایہ فراہم کرنے والا ہر فرد چونکہ خطرہ بھی مول لیتا ہے۔ اس لئے وہ جزوی یا کلی طور پر آجر بھی ہے' اور تقسیم دولت میں سرمائے اور آجر دونوں کا صلہ منافع ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ سرمایہ اور آجر دو الگ الگ عاملِ پیداوار نہیں' بلکہ یہ ایک ہی عامل ہے اور تقسیم دولت میں اسکو منافع ملتا ہے۔ بہر صورت جس طرح زمین کو معین کرایہ اور محنت کو معین اجرت دی جاتی ہے اس طرح سرمائے کو معین سود نہیں دیا جا سکتا' سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کو زمین پر قیاس کیا جاتا ہے کہ جس طرح زمین فراہم کر کے ایک شخص معین کرایہ وصول کر سکتا ہے اسی طرح سرمایہ فراہم کر کے معین سود بھی وصول کر سکتا ہے۔ لیکن اسلامی احکام کی رو سے یہ قیاس درست نہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ زمین اور سرمائے میں مندرجہ ذیل تین وجوہ سے زبردست فرق پایا جاتا ہے۔

۱۔ زمین بذات خود ایک قابل انتفاع چیز ہے' اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسے خرچ کرنا نہیں پڑتا بلکہ اس کا وجود برقرار رکھتے ہوئے اسے عامل پیدائش کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے' اور اس سے دوسرے فوائد بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا

اس کا کرایہ در حقیقت ان فوائد کا معاوضہ ہے جو زمین براہ راست دے رہی ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ یعنی روپیہ ایسی چیز ہے' جو بذات خود قابل انتفاع نہیں' وہ اس وقت تک انسان کو فائدہ نہیں پہنچاتا جب تک اسے خرچ کرکے اس کے بدلے کوئی قابل انتفاع چیز خرید نہ لی جائے۔ لہٰذا جس نے کسی کو روپیہ فراہم کیا' اس نے کوئی ایسی چیز فراہم نہیں کی جو براہ راست قابل انتفاع ہو۔ لہٰذا اس پر کرایہ وصول کرنے کا سوال نہیں' کیونکہ کرایہ اس چیز کا ہوتا ہے' جس سے اس کا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ اٹھایا جائے۔

۲۔ زمین' مشینری' آلات وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے استعمال سے ان کی قدر میں کمی ہوتی ہے' اسی لئے ان چیزوں کو جتنا زیادہ استعمال کیا جائے گا' ان کی قدر اتنی ہی گھٹتی جائے گی۔ لہٰذا ان چیزوں کا جو کرایہ وصول کیا جاتا ہے اس میں قدر کے نقصان کی تلافی بھی شامل ہوتی ہے' اس کے برخلاف روپیہ ایسی چیز ہے کہ محض استعمال سے اس کی قدر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

۳۔ اگر کوئی شخص کوئی زمین' مشینری یا سواری کرایہ پر لیتا ہے تو یہ چیزیں اس کے ضمان (Risk) میں نہیں ہوتیں' بلکہ اصل مالک کے ضمان میں رہتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں کرایہ دار کی کسی غفلت یا زیادتی کے بغیر کسی سماوی آفت کے نتیجے میں تباہ ہوجائیں یا چوری ہوجائیں تو نقصان کرایہ دار کا نہیں' بلکہ اصل مالک کا ہوگا اور چونکہ اصل مالک ان کی تباہی کا خطرہ برداشت کر رہا ہے اور کرایہ دار کو اس خطرہ سے آزاد کرکے اپنی ملکیت کے استعمال کا حق دے رہا ہے۔ اس لئے وہ ایک معین کرایہ کا بجا طور پر حق دار ہے۔ اس کے برعکس جو شخص کسی کو روپیہ قرض دے رہا ہے' وہ روپیہ اس کے ضمان (Risk) میں نہیں رہتا، بلکہ قرض دار کے ضمان میں چلا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرض دار کے قبضے میں جانے کے بعد اگر وہ روپیہ کسی سماوی آفت سے تباہ ہوجائے' یا چوری ہوجائے تو نقصان قرض دینے والے کا نہیں' قرض لینے والے کا ہے۔ یعنی قرض دار شخص اس صورت میں بھی اتنا روپیہ قرض خواہ پر لوٹانے کا ذمہ دار اور پابند ہے اور چونکہ قرض دینے والے نے قرض دیکر اس روپیہ کا کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔ اس لئے وہ اس پر کسی معاوضے کا حقدار نہیں۔

اس تشریح کی روشنی میں تقسیم دولت کے اسلامی اصول کا سرمایہ دارانہ اصول سے ایک بنیادی فرق تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کو معین شرح سے سود دیا جاتا ہے جبکہ اسلام میں سرمایہ کا حق منافع ہے' جو اسے اسی وقت ملے گا' جب وہ نقصان کا خطرہ بھی برداشت کرے۔ یعنی کاروبار کے نفع و نقصان دونوں میں شریک ہو' جس کا طریقہ شرکت یا مضاربت ہے۔

اور دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت ۔ دونوں نظاموں میں دولت کا استحقاق صرف ان عاملینِ پیدائش کی حد تک محدود رکھا گیا ہے ' جنہوں نے عمل پیدائش میں ظاہری طور پر براہ راست حصہ لیا۔ لیکن اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہرچیز پر حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے ' اور ہرچیز کی پیدائش کا اصل کارنامہ اللہ تعالیٰ ہی انجام دیتے ہیں ۔ جن کی توفیق کے بغیر کوئی عاملِ پیدائش ایک ذرہ بھی وجود میں نہیں لا سکتا ' لہٰذا کوئی بھی عاملِ پیدائش بذاتہٖ آمدنی کا مالک اور مستحق نہیں ' بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو مستحق قرار دیں گے وہی مستحق ہو گا ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ آمدنی کا اولین مستحق تو عوامل پیدائش ہی کو قرار دیا ہے ' لیکن دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست رکھی ہے ۔ جو پیدا شدہ دولت میں اسی طرح حقدار ہیں جس طرح خود عواملِ پیدائش ۔ یہ ثانوی مستحقین معاشرے کے وہ افراد ہیں ' جو اگرچہ قلت وسائل کی وجہ سے اس عمل پیدائش میں براہ راست حصہ نہیں لے سکے ۔ لیکن اسی انسانی معاشرے کا فرد ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی دولت میں ان کا بھی حصہ ہے ۔ ان ثانوی مستحقین تک دولت پہنچانے کے لئے اسلام نے زکوٰۃ ' عشر ' صدقات ' خراج ' کفارات ' قربانی اور وراثت کے احکام دیئے ہیں ۔ جن کے ذریعہ دولت کا بڑا حصہ ان ثانوی مستحقین تک پہنچ جاتا ہے ۔ دولت کے اولین مستحق یعنی عوامل پیداوار ' آمدنی خواہ کرائے کی صورت میں حاصل ہوئی ہو یا اجرت کی صورت میں منافع کی صورت میں ' ان میں سے ہر شخص اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنی آمدنی میں سے ایک معتدبہ حصہ ان ثانوی مستحقین تک پہنچائے اور یہ اس کی طرف سے کوئی احسان نہیں ' بلکہ اسکے ذمے ان کا حق ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا :

" وفی اموالھم حق معلوم ۝ للسائل و المحروم ۝

اور ان کے مالوں میں محتاج اور محروم کا معین حق ہے ۔

اسی طرح زرعی پیداوار کے بارے میں ارشاد فرمایا :

و اٰتوا حقہ یوم حصادہ

اور کھیتی کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو "

پیدائشِ دولت پر تینوں نظاموں کے مجموعی اثرات

یہ تھا اشتراکیت ' سرمایہ داری اور اسلام کی معاشی تعلیمات کا ایک مختصر تعارف ۔

تینوں نظاموں میں معیشت پر مجموعی حیثیت سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ایک بہت طویل الذیل موضوع ہے' جس کی طرف یہاں محض اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک پیدائش دولت کا تعلق ہے' تو پیچھے یہ بتایا جا چکا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کو بالکل آزاد چھوڑنے کے نتیجے میں کیا خرابیاں پیدا ہوئیں؟ یہ خرابیاں معاشی بھی ہیں اور اخلاقی بھی۔ اشتراکیت نے ذاتی منافع کے محرک کو بالکل ختم کر دیا۔ جس کے نتیجے میں پیداوار کی کمیت (Quantity) اور کیفیت (Quality) دونوں میں کمی آئی کیونکہ اشتراکیت میں ہر کام کرنے والے کو طے شدہ اجرت ہی ملتی ہے تو اس کو اس کام سے ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی۔ جو اسے کارکردگی بہتر بنانے پر آمادہ کرتی' اس کا تھوڑا سا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ پاکستان میں بھی ایک مرتبہ مختلف صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا اور یہ اسی اشتراکی پروپیگنڈے کا نتیجہ تھا۔ سالہا سال کے تجربے کے بعد قومی ملکیت میں لئے گئے ادارے مسلسل انحطاط پذیر رہے۔ جس کے نتیجے میں بالآخر انہیں دوبارہ ذاتی ملکیت میں دیا جا رہا ہے۔ جس کے لئے آج کل نج کاری (Privatization) کی اصطلاح استعمال ہو رہی ہے۔

یہی حال روس میں ہوا کہ پیداوار کی کمیت اور کیفیت میں اتنا نقصان آیا کہ ملک دیوالیہ ہونے کے قریب ہو گیا۔ سوویت یونین تو بعد میں شکست و ریخت کا شکار ہوا' لیکن اس سے کئی سال پہلے جب سوویت یونین کے حکمران کمیونزم کو سنبھالا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت سوویت یونین کے صدر میخائل گورباچوف نے ملک کی تعمیر نو کا پروگرام اپنی کتاب پیرس ٹرائیکا (Perestroica) میں پیش کیا تھا۔ اس کتاب میں اس نے کمیونزم کی براہ راست تردید نہیں کی تھی' لیکن اس بات پر زور دیا کہ اشتراکیت کی نئی تشریح کی ضرورت ہے اور اس نئی تشریح میں اس بات کا بار بار اعتراف کیا کہ اب ہمیں اپنی معیشت از سر نو تعمیر کرنے کے لئے بازار کی قوتوں (Market Forces) سے ضرور کام لینا پڑے گا۔

اسلام نے ایک طرف ذاتی منافع کے محرک کو تسلیم کیا' جو پیداوار کی کمیت اور کیفیت میں اضافے کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس پر وہ پابندیاں عائد کر دیں' جو اسے ان معاشی اور اخلاقی خرابیوں سے باز رکھ سکے' جو سرمایہ دارانہ نظام کا لازمی خاصہ ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ دارانہ نظام میں سود کی اجازت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کسی کاروبار کو سرمایہ فراہم کرنے والا کاروبار کی بہبود سے قطعی لاتعلق رہتا ہے' اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کاروبار کو فائدہ ہوا یا نقصان کیونکہ اسکو ہر صورت میں معین شرح سے سود ملتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام میں چونکہ سود حرام ہے۔ اس لئے

کسی کاروبار کو سرمایہ فراہم کرنے (Financing) کی بنیاد شرکت اور مضاربت پر ہی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں سرمایہ فراہم کرنے والے کی پوری خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ جس کاروبار میں اس نے سرمایہ لگایا ہے، وہ ترقی کرے، اور اسے نفع حاصل ہو، ظاہر ہے کہ اس سے پیدائش دولت پر بہتر اثرات قائم ہوں گے۔

تقسیم دولت پر تینوں نظاموں کے اثرات

جہاں تک تقسیم دولت کا تعلق ہے، اشتراکیت نے ابتداءً یہ دعویٰ کیا تھا کہ منصوبہ بند معیشت میں آمدنی کی مساوات قائم ہوگی، جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام افراد کو برابر آمدنی ملے۔ لیکن یہ محض ایک نظریاتی خواب تھا اور بعد میں نہ صرف یہ کہ عملاً بھی مساوات قائم نہیں ہوئی۔ بلکہ نظریاتی طور پر بھی مساوات کا دعویٰ واپس لے لیا گیا۔ اور وہاں بھی اجرتوں کے درمیان شدید تفاوت قائم ہوا۔ چونکہ اجرتوں کا تعین تمام تر حکومت کرتی تھی، اس لئے اس تعین میں ایک عام مزدور کو کوئی دخل نہیں تھا اور اگر اسکو اجرت کا یہ تعین غیر منصفانہ محسوس ہو تو اس کے خلاف چارہ جوئی کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کم از کم یہ ہوتا ہے کہ اگر مزدور اپنی اجرت بڑھوانا چاہیں تو اس کے لئے نہ صرف یہ کہ آواز بلند کر سکتے ہیں بلکہ احتجاج کے دوسرے ذرائع مثلاً ہڑتال وغیرہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اشتراکی نظام سیاست میں اس قسم کی آواز بلند کرنے یا احتجاج کے ذرائع اختیار کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے عملاً اشتراکی نظام میں مزدور کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا، بلکہ آخر میں نتیجہ یہی نکلا کہ اشتراکی ممالک کے محنت کشوں کا معیار زندگی سرمایہ دارانہ نظام کے مزدور سے بھی کم تر رہا۔ اور بالآخر لوگوں نے تنگ آکر پھر اسی سرمایہ دارانہ نظام کا خیر مقدم کیا، جس سے وہ نکل کر بھاگے تھے۔ یہ نتائج ان ملکوں میں زیادہ واضح طور پر مشاہدے میں آئے، جہاں ایک ہی ملک کا کچھ حصہ اشتراکیت کے زیر اثر تھا اور دوسرا حصہ سرمایہ دارانہ نظام کے زیر اثر تھا۔ مثلاً مشرقی اور مغربی جرمنی، مغربی جرمنی ترقی کرتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ گیا، اور مشرقی جرمنی اس کے مقابلے میں بہت پیچھے رہا۔ وہاں کے مزدوروں کی حالت بھی مغربی جرمنی کے مقابلے میں پس ماندہ رہی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے تنگ آکر دیوار برلن توڑ دی، اور اشتراکیت کی ناکامی کا عملاً اعتراف کر لیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں تقسیم دولت واقعتاً منصفانہ تھی، واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جن خرابیوں کے ردعمل کے طور پر اشتراکیت وجود میں آئی تھی وہ بڑی حد تک اب بھی برقرار ہیں، ذاتی منافع کے

محرک کو بے لگام چھوڑنے سے اجارہ داریاں اب بھی وجود میں آتی ہیں۔ سود' قمار' اور سٹے کا بازار اب بھی گرم ہے' جس کے نتیجے میں ہزار ہا عوام کی دولت کھچ کھچ کر چند افراد کے ہاتھوں میں سمٹتی رہتی ہے' اور عوام کے سفلی جذبات کو برانگیختہ کر کے ان سے پیسے کھینچنے کا عمل اب بھی جاری ہے' بہت سے سرمایہ دار ممالک میں ایسے لاکھوں افراد اب بھی موجود ہیں' جن کے پاس سر چھپانے کو گھر نہیں اور سردیوں کی راتوں میں زیر زمین ریلوے اسٹیشنوں میں پناہ لیتے ہیں۔

اس صورت حال کی بہت بڑی ذمہ داری سود' قمار اور سٹے پر عائد ہوتی ہے۔ قمار اور سٹے میں تو یہ بات واضح ہے کہ ان کے ذریعہ بہت سے افراد کا سرمایہ کھچ کھچ کر کسی ایک شخص کی جیب پر محض بر سادیتا ہے' لیکن سود کے نتیجے میں تقسیم دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے' اس کی طرف عام طور سے توجہ نہیں دی جاتی' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سود بہرصورت تقسیم دولت کے توازن میں بگاڑ پیدا کرتا ہے' کیونکہ جو شخص کسی دوسرے سے قرض لیکر کاروبار کرتا ہے' اگر اسے کاروبار میں نقصان ہو تو قرض دینے والا بہرصورت اپنے سود کا مطالبہ جاری رکھتا ہے' بلکہ سود در سود ہو کر اسکی واجب الاداء رقم کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح قرض لینے والا سراسر نقصان میں ہے اور قرض دینے والا سراسر فائدہ میں۔ دوسری طرف جو بڑے سرمایہ دار بنکوں سے بھاری رقمیں لیکر بڑے پیمانے کے کاروبار کرتے ہیں' ان کو اپنے اس کاروبار میں بھاری نفع ہوتا ہے' اس کا وہ بہت تھوڑا حصہ سود کی شکل میں بنک کو اور بنک کے واسطے سے امانت دار عوام کو منتقل کرتے ہیں۔ باقی سارا نفع خود رکھتے ہیں اور اس طرح دونوں صورتوں میں تقسیم دولت غیر متوازن ہوتی ہے۔

اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی جیب سے صرف دس لاکھ روپے کسی کاروبار میں لگائے اور نوے لاکھ روپے بنک سے قرض لے لئے۔ اور اس طرح ایک کروڑ روپے سے تجارت کی' جب اتنی بھاری رقم سے تجارت کی جائے گی تو اس پر نفع کی شرح بھی بہت زیادہ ہوگی' فرض کیجئے کہ کاروبار میں پچاس فیصد نفع ہوا' اور ایک کروڑ کے ڈیڑھ کروڑ بن گئے' تو یہ سرمایہ دار پچاس لاکھ کے نفع سے صرف پندرہ لاکھ روپے سود کے طور پر بنک کو دے گا' جس میں سے بنک اپنا نفع رکھ کر بمشکل دس یا بارہ لاکھ روپے ان سینکڑوں عوام میں تقسیم کرے گا جن کی امانتیں اس کے پاس جمع ہیں' جس کا خالص نتیجہ یہ ہے کہ اس کاروبار میں جن سینکڑوں افراد نے نوے لاکھ روپے کا سرمایہ لگایا تھا' اور انہی کے سرمایہ نے درحقیقت اتنے بھاری نفع کو ممکن بنایا' ان میں تو کل دس بارہ لاکھ روپے تقسیم ہوئے

اور جس سرمایہ دار نے کل دس لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی تھی۔ اسے کاروبار کے نفع کی صورت میں پینتیس لاکھ روپے ملے۔ پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پندرہ لاکھ روپے جو بنک کو دیئے گئے اور بنک کے واسطے سے عوام تک پہنچے' ان کو سرمایہ دار اپنی مصنوعات کی لاگت میں شامل کرتا ہے' اور جو بالآخر اسکی جیب پر نہیں پڑتے بلکہ عام صارفین کی جیب پر پڑتے ہیں' کیونکہ اس کاروبار میں اس نے جو مصنوعات تیار کیں ان کی قیمت مقرر کرتے وقت بنک کو دیئے ہوئے سود کی رقم بھی قیمت میں شامل کرتا ہے اور اس طرح درحقیقت اس کی اپنی جیب سے کچھ خرچ نہیں ہوا اور اگر کاروبار میں کسی سماوی آفت یا کسی حادثے وغیرہ کی وجہ سے نقصان ہونے لگے تو اس نقصان کی تلافی انشورنس کمپنی کے ذریعہ کرالی جاتی ہے اور اس انشورنس کمپنی میں بھی ان ہزارہا عوام کا پیسہ جمع رہتا ہے جو ماہ بماہ یا سال بسال اپنی کمائی کا ایک حصہ یہاں جمع کراتے رہتے ہیں' لیکن نہ ان کے کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے اور نہ کوئی اور حادثہ پیش آتا ہے۔ اس لئے عموماً پیسے جمع ہی کراتے ہیں' نکلوانے کی نوبت کم آتی ہے۔

دوسری طرف اگر اس قسم کے بہت سے سرمایہ دار کسی بھاری نقصان کی وجہ سے بنک کو قرضے واپس نہ کرسکیں' اور اس کے نتیجے میں بنک دیوالیہ ہوجائے' تو اس صورت میں ان سرمایہ داروں کی تو بہت کم رقم گئی' نقصان سارا ان امانت داروں کا ہوا جن کے پیسے کے بل سرمایہ دار کاروبار کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سود کے اس نظام کی وجہ سے پوری قوم کے سرمائے کو چند بڑے سرمایہ دار اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں قوم کو بہت تھوڑا سا حصہ واپس کرتے ہیں اور یہ تھوڑا حصہ بھی اشیاء کی لاگت میں شامل کرکے دوبارہ عام صارفین ہی سے وصول کرلیتے ہیں اور اپنے نقصان کی تلافی بھی عوام کی بچتوں سے کرتے ہیں اور اس طرح سود کا مجموعی رخ اس طرف رہتا ہے کہ عوام کی بچتوں کا کاروباری فائدہ زیادہ تر بڑے سرمایہ داروں کو پہنچے' اور عوام اس سے کم سے کم مستفید ہوں' اس طرح دولت کے بہاؤ کا رخ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ جب سے دنیا میں صنعتی انقلاب برپا ہوا' اس وقت سے کوئی ملک ایسی مثال پیش نہیں کرسکا' جہاں صنعت اور تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلام کے معاشی احکام بھی پوری طرح نافذ ہوں۔ اس لئے کسی عملی نمونے کے حوالے سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے تقسیم دولت میں کس طرح توازن پیدا ہوتا ہے۔ لیکن خالص نظریاتی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کی صورت میں دولت کی تقسیم سرمایہ دارانہ نظام

کے مقابلے میں کہیں زیادہ متوازن ہوگی۔ اگر ایک حرمت سود کے مسئلے ہی کو لے لیا جائے تو اس سے بھی یہ بات واضح ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سود کے ممنوع ہونے کے بعد کسی کاروبار کو سرمایہ کی فراہمی نفع نقصان میں شرکت کی بنیاد ہی پر ہو سکتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اگر روپیہ لینے والے کو نقصان ہوا ہے تو اس میں روپیہ دینے والا بھی شریک ہو گا۔ اور اگر نفع ہوا ہے تو روپیہ دینے والا اس نفع کے فیصد حصے کا حق دار ہو گا۔ لہٰذا مذکورہ بالا مثال میں اگر سرمایہ دار نے بنک سے نوّے لاکھ روپے لیتے وقت شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر معاملہ کیا ہو اور اس کے اور بنک کے درمیان اگر ساٹھ فیصد اور چالیس فیصد کا تناسب بھی طے ہوا ہو تو پچاس لاکھ کے منافع میں سے کم از کم بیس لاکھ روپے اسے بنک کو منتقل کرنے پڑیں گے اور بنک کو دیئے جانے والے نفع کا تعین چونکہ اشیاء کی فروختگی کے بعد ہو گا اس لئے اسکو اشیاء کی لاگت میں شامل کر کے قیمت کے ذریعہ عوام سے وصول نہیں کیا جا سکتا۔

پھر جو نفع اس طرح سرمایہ دار کو حاصل ہو گا، اس میں سے بھی زکوٰۃ اور صدقات وغیرہ کے ذریعہ ایک بڑا حصہ وہ غریب عوام کی طرف منتقل کرنے کا پابند اور ذمہ دار ہو گا۔ اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ دولت کے بہاؤ کا رخ چند سرمایہ داروں کے بجائے ملک کے عام باشندوں کی طرف ہو گا۔ اور جن عوام کی بچتوں سے ملک کی صنعت و تجارت فروغ پا رہی ہے، اس کے منافع میں وہ زیادہ بہتر شرح سے حصہ دار ہوں گے۔

کاروبار کی مختلف اقسام (بہ لحاظ ملکیت)
(Different Kinds of Business)

اشتراکی نظام میں چونکہ سارا نظام حکومتی پالیسی کے تحت چلتا ہے' اس لئے اس میں تو انفرادی اور ذاتی نوعیت کے کاروبار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا کاروبار کی اقسام پر یہ گفتگو سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہے۔

ملکیت کے لحاظ سے کاروبار کی تین قسمیں ہیں

۱)۔۔۔ شخصی کاروبار (Private Proprietorship.)

۲)۔۔۔ شرکت (Partnership.)

۳)۔۔۔ کمپنی (Joint Stock Company)

پہلی دو قسموں کا کاروبار اس وقت سے جاری ہے' جب سے انسان کاروبار کر رہا ہے۔ فقہاء نے بھی ان کی بنیادی تفصیلات اور ان کے احکام ذکر کئے ہیں۔ اور ان کی موجودہ صورتحال ماضی سے بنیادی طور پر مختلف نہیں' اس لئے یہاں ان کی تفصیلات کا ذکر نہیں ہوگا' البتہ "کمپنی" کاروبار کی ایک نئی قسم ہے جس کا پہلے فقہاء کے دور میں وجود نہ تھا' اس لئے یہاں اس کی تفصیلات ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔

کمپنی کا تعارف

کمپنی کے لغوی معنی "شرکت" ہیں اور کبھی "رفقائے کار" کو بھی کہا جاتا ہے بعض دوکانوں کے نام میں "فلاں اینڈ کمپنی" لکھا ہوا ہوتا ہے' اس سے یہ لغوی معنی ہی مراد ہوتے ہیں جس کو عربی میں "فلان وشرکاءہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے وہ معاشی اور اصطلاحی معنی مراد نہیں ہوتے جس کا یہاں تعارف کرایا جارہا ہے۔ لیکن جب "اینڈ" کے لفظ کے بغیر کسی تجارتی ادارے کے نام میں کمپنی کا لفظ ہو' مثلاً "تاج کمپنی" تو اس سے مراد اصطلاحی کمپنی ہوتی ہے' اور عموماً اس کے ساتھ لمیٹڈ کا لفظ بھی ہوتا ہے جس کی تشریح آگے آئے گی۔

یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد سترہویں صدی کے آغاز میں بڑے بڑے کارخانوں وغیرہ کے قائم کرنے کے لئے جب عظیم سرمایہ کی ضرورت پڑنے لگی' جس کو کوئی شخص اکیلا یا چند افراد مل کر فراہم نہیں کر سکتے تھے تو اس وقت عام لوگوں کی منتشر بچتیں یکجا کر کے ان سے اجتماعی فائدہ اٹھانے کے لئے کمپنی کا نظام رائج ہوا۔ اس نظام

کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک کی الگ الگ ملکیت متصور ہوتی ہے۔ مگر اس نظام میں کئی افراد کے مجموعے کو ایک شخص قانونی قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی وضاحت انشاء اللہ آگے آئے گی۔ اس شخصِ قانونی کو "کارپوریشن" کہتے ہیں جس کی ایک قسم کمپنی ہے۔

ابتداء کمپنیاں عموماً نیم سرکاری ہوتی تھیں، عموماً حکومت کے چارٹر (اجازت نامے) کے تحت غیر ملکی تجارت کے لئے وجود میں آتی تھیں اور انہیں بہت وسیع اختیارات دیئے جاتے تھے۔ بسا اوقات ان کو قوانین تجارت وضع کرنے کا بھی اختیار ہوتا تھا، سکہ ڈھالنے اور فوج اور پولیس رکھنے کا بھی اختیار ہوتا تھا۔ برصغیر پر قابض ہونے والی "ایسٹ انڈیا کمپنی" بھی اسی قسم کی ایک کمپنی تھی۔ اب وسیع اختیارات کے ساتھ ایسی ریاستی کمپنیاں موجود نہیں رہیں، اب صرف تجارتی کمپنیاں ہوتی ہیں جو حکومت کی اجازت سے قائم ہوتی ہیں کمپنیوں کی تشکیل کی اجازت اور ان کو کنٹرول کرنے کا کام جو ادارہ کرتا ہے اس کو ہمارے ملک میں (Corporate Law Authority) (کارپوریٹ لاء اتھارٹی) کہا جاتا ہے۔ یہ وزارت خزانہ کا ذیلی ادارہ ہے۔

کمپنی کی تشکیل

سب سے پہلے ابتدائی مرحلے میں ماہرین کے مشورے سے ایک رپورٹ تیار کی جاتی ہے۔ جس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ جو کاروبار شروع کرنا ہے اس کے امکانات کس حد تک ہیں؟ اس کے لئے وسائل اور سرمایہ کتنا درکار ہوگا؟ تجارتی لحاظ سے یہ کاروبار کس حد تک نفع بخش ہے؟ یہ رپورٹ مختلف شعبوں کے ماہرین سے تیار کرائی جاتی ہے، اس کو "تقریر الامکانیات" (Feasibility Report) کہتے ہیں۔

پھر کمپنی کا اجمالی ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے، جس میں کمپنی کا نام، کاروبار کی نوعیت، مطلوبہ سرمایہ، ڈائریکٹرز، آئندہ کے لئے ان کے عزل و نصب کا طریقہ کار وغیرہ لکھا جاتا ہے، اس کو "مذکرہ" (Memorandum) کہتے ہیں۔

پھر کمپنی کے انتظامی ضوابط لکھے جاتے ہیں جس کو عربی میں نظام الجمعیة یا لائحة الجمعیة اور انگریزی میں (Articles of Association) کہتے ہیں۔

میمورنڈم (مذکرہ) اور آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن کے ساتھ حکومت کو کمپنی کی اجازت کے لئے درخواست دیدی جاتی ہے۔ جب وزارت خزانہ کے ذیلی ادارہ (Corporate Law Authority) (کارپوریٹ لاء اتھارٹی) کی طرف سے اجازت مل گئی تو اب کمپنی وجود میں آچکی ہے۔ اور قانون اب اس کو ایک فرضی شخص قرار دیتا ہے جو بیع و شراء کرے گا، مدعی و مدعیٰ علیہ بنے گا، دائن و مدیون ہوگا۔

اس کو "شخص قانونی" (Legal person) یا (Juristic Person) یا (Juridical Person) کہتے ہیں۔ بعض مرتبہ اس کو فرضی شخص (Fictitious Person) بھی کہا جاتا ہے۔

جب کمپنی وجود میں آگئی تو اب لوگوں کو حصہ دار بننے کی دعوت دینے کے لئے قانوناً ضروری ہے کہ کمپنی کا پورا طریق کار اور اسکا ترکیبی ڈھانچہ شائع کرایا جائے تاکہ عوام کو بھی اس کمپنی پر اعتماد ہو سکے۔ لوگوں کو کمپنی کے بنیادی طریق کار اور متعلقہ امور سے واقف کرنے کے لئے جو تحریری بیان شائع کیا جاتا ہے' اس کو عربی میں "نشرۃ الاصدار" اور انگریزی اور اردو میں پراسپکٹس (Prospectus) کہتے ہیں۔

کمپنی کا سرمایہ

حکومت جب کمپنی کو اجازت دیتی ہے تو سرمائے کی تحدید کرتی ہے کہ اتنے سرمائے کے حصے جاری کئے جا سکتے ہیں یا اتنے سرمائے میں لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جا سکتی ہے اس کو "منظور شدہ سرمایہ" "راس المال المسموح" یا "راس المال المصرح بہ" (Authorised Capital) کہتے ہیں۔

اس میں سے سرمائے کی کچھ مقدار مقرر کر دی جاتی ہے جو کمپنی جاری کرنے والوں کی طرف سے شامل کیا جائے گا اس کو (Sponsors Capital) کہتے ہیں۔ پھر حصص جاری کرنے کے بعد عوام یا کمپنی قائم کرنے والوں نے جتنے سرمائے کے حصص لینے کا وعدہ کیا' اس کو "اشتراک شدہ سرمایہ" (Subscribed Capital) کہا جاتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے کمپنی میں اشتراک (Subscription) کر لیا ہو' اور سرمایہ کی ادائیگی ذمے لے لی ہو' ان سے سرمایہ فوری طور پر یکمشت شامل کرنا ضروری نہیں ہوتا' بھی تدریجاً بھی ادا کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ سرمائے کا جتنا حصہ ادا کر دیا گیا ہو' اس کو "ادا شدہ سرمایہ" "راس المال المدفوع" (Paid Up Capital) کہتے ہیں۔

کمپنی جس سرمائے کے شیئرز جاری کر کے لوگوں کو حصے لینے کی دعوت دے' اس سرمائے کو "جاری کردہ سرمایہ" "راس المال المعروض" (Issued Capital) کہتے ہیں۔

لوگ فارم پر کر کے جتنے سرمائے کے حصے خریدنے کا وعدہ کرلیں اس کو۔ "اشتراک کردہ سرمایہ" "راس المال المساھم یا راس المال المکتتب" (Subscribed Capital) کہتے ہیں۔

مثلاً۔ کمپنی کو ۱۰۰ ملین روپے سے کاروبار کی اجازت ملی تو ۱۰۰ ملین روپے "منظور شدہ سرمایہ" ہے۔ اس میں سے ۲۰ ملین کمپنی قائم کرنے والوں کے ذمے ہے'

جس میں سے ۱۰ ملین روپے انہوں نے دیدیئے۔یہ سپانسرز کیپٹل کا "اداشدہ سرمایہ" ہے۔ ۸۰ ملین عوام سے وصول کرنا ہے۔جس میں سے فی الحال ۶۰ ملین روپے کے حصے جاری کئے جاتے ہیں' باقی آئندہ کی کسی ضرورت کیلئے محفوظ رکھ لئے گئے ہیں۔ یہ ۶۰ ملین روپے "جاری کردہ سرمایہ" ہے۔ ۶۰ ملین روپے میں سے لوگوں نے ۵۰ ملین روپے کے لئے فارم جمع کرادیئے تو یہ "اشتراک کردہ سرمایہ" ہے۔

اگر درخواستیں زیادہ ہوں اور جاری کردہ سرمایہ کم ہو تو قرعہ اندازی کی جاتی ہے اور صرف انہی کی درخواستیں قبول کر کے انہیں حصہ دار بنایا جاتا ہے جن کا نام قرعہ میں نکل آئے۔یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ درخواستیں سرمائے سے کم وصول ہوں۔ جتنے شیئرز جاری کئے گئے تھے لوگوں نے اتنے شیئرز نہیں لئے تو اس سے نمٹنے کے لئے بنک یا دوسرے مالیاتی اداروں سے اس بات کی ضمانت لی جاتی ہے کہ جو حصے لوگوں نے نہ لئے وہ ہم لے لیں گے۔اس ضمانت کو "ضمان الاکتتاب" (Under Writing) کہتے ہیں۔

بنک اس ضمانت پر کمپنی سے کمیشن کی شرح طے کرتا ہے۔ مثلاً اس ضمانت پر کل سرمایہ کا ایک فیصد میں لوں گا۔یہ کمیشن بنک بہرحال لیتا ہے چاہے اس کو کمپنی کے حصص (شیئرز) لینے پڑیں یا نہ لینے پڑیں۔ پھر اگر بنک کو حصے لینے پڑ جائیں تو حصے لے کر عموماً بنک اپنے پاس نہیں رکھتا' بلکہ بعد میں ان حصص کو فروخت کر دیتا ہے۔

یہ ضمانت ایک بنک سے بھی لی جاتی ہے اور تھوڑے تھوڑے سرمائے پر کئی بنکوں سے بھی لی جاسکتی ہے۔

کمپنی کے حصص (شیئرز)۔

جب لوگ کمپنی کے حصے لے کر سرمایہ دیدیتے ہیں' تو حصہ دار کو کمپنی ایک سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے جو اس بات کی سند ہوتی ہے کہ اس شخص کا کمپنی میں اتنا حصہ ہے۔اس سرٹیفکیٹ کو اردو میں "حصہ" عربی میں "سہم" اور انگریزی میں (Share) کہتے ہیں۔

کاروبار جتنے سرمائے سے جاری کیا جاتا ہے اس سرمائے کو اکائیوں پر تقسیم کر کے ایک اکائی کو ایک حصے (Share) کی قیمت قرار دی جاتی ہے۔ مثلاً آج کل عموماً دس' دس روپے کے شیئرز جاری کئے جاتے ہیں۔یہ قیمت شیئر کے اوپر لکھدی جاتی ہے۔یہ وہ رقم ہے جسکی ادائیگی پر یہ سرٹیفکیٹ جاری ہوا تھا۔اس قیمت کو عربی میں "القیمة الاسمیة" اور انگریزی میں (Face Value) یا (Par Value) کہتے ہیں۔

شیئرز جاری کرنے کے دو طریقے ہیں۔کبھی شیئر پر حصہ دار کا نام درج ہوتا ہے اس کو "السهم المسجل" (Registered Share) کہتے ہیں۔کبھی شیئر اس طرح جاری

ہوتے ہیں کہ اس پر کسی کا نام درج نہیں ہوتا، جس کے ہاتھ میں ہوگا وہی اس کا مالک سمجھا جائے گا۔ اس کو "السہم لحاملہ" (Bearer Share) کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں زیادہ تر کمپنیوں کے حصص رجسٹرڈ ہی ہوتے ہیں۔ کبھی بیئرر بھی ہوتے ہیں۔ جیسے این 'آئی' ٹی میں دونوں صورتیں ہیں۔

حصص کی ایک تقسیم حصہ دار کے حقوق کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یعنی نفع وصول کرنے یا کمپنی کی پالیسی میں مداخلت کے اعتبار سے بھی حصص کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) السہم العادی (Ordinary Share)

(۲) السہم الممتاز (Preference Share) جس کو "ترجیحی حصص" بھی کہتے ہیں

——— ان دو قسم کے حصص میں بنیادی فرق یہ ہے کہ "السہم الممتاز" کے حامل کو نفع تقسیم کرنے یا حق رائے دہی میں "السہم العادی" کے حامل سے مقدم رکھا جاتا ہے۔

"السہم الممتاز" کی ترجیح کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) "السہم الممتاز" کا نفع اس کے لگائے ہوئے سرمائے کی خاص شرح کے مطابق مقرر ہوتا ہے۔ (مثلاً اس کے لگائے ہوئے سرمائے کا دس فیصد (%۱۰) پہلے "السہم الممتاز" کے حاملین میں نفع تقسیم کر کے انکا معین نفع ان تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کچھ بچے تو "السہم العادی" کے حاملین کو ملتا ہے، ورنہ وہ نفع سے محروم رہیں گے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سال کمپنی کو نفع نہیں ہوا تو ایسی صورت میں بھی "السہم الممتاز" کا نفع محفوظ رہتا ہے، آئندہ سال جب نفع ہوگا تو پہلے ان کو دیا جائے گا، اس کے بعد نفع بچا تو "السہم العادی" کو ملے گا۔

(۲) بعض اوقات ترجیح کی صورت یہ ہوتی ہے کہ "السہم الممتاز" کے نفع کی شرح "السہم العادی" سے زیادہ رکھی جاتی ہے۔

(۳) کبھی ترجیح اس طرح ہوتی ہے کہ کمپنی کے سالانہ اجلاس میں "السہم الممتاز" والوں کو ووٹ کا حق ہوتا ہے۔ "السہم العادی" والے کو ووٹ کا حق نہیں ہوتا۔

(۴) کبھی "السہم الممتاز" والے کو زیادہ ووٹ کا حق ہوتا ہے اور "السہم العادی" کو کم ووٹ کا۔ مثلاً یہ کہ "السہم الممتاز" والے کو دو ووٹ کا اور "السہم العادی" والے کو ایک ووٹ کا حق ہوگا۔

حاصل یہ کہ "السہم الممتاز" ترجیحی حصے کا نام ہے، پھر ترجیح کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ اس کی ضرورت عموماً اس وقت پیش آتی ہے، جب کہ کسی خاص بڑی پارٹی (مثلاً انشورنس کمپنی وغیرہ) سے سرمایہ لینا ہو۔ اب وہ اس پر آمادہ نہیں کہ عام حصہ دار (شیئر ہولڈر) کی حیثیت سے رقم لگائے اس لئے کہ اس میں نفع طے شدہ نہیں۔ اور اس پر بھی آمادہ نہیں کہ محض قرض دہندہ (دائن) کی طرح سود پر قرض دے، اس لئے کہ محض

قرض دہندہ کی حیثیت میں وہ کمپنی کی پالیسی پر اثر انداز نہیں ہوسکے گی۔ ایسی پارٹی سے سرمایہ لینے کے لئے اس کو ترجیحی حصص دیئے جاتے ہیں' تاکہ اس کو مقررہ نفع بھی ملے اور کمپنی میں حصہ دار بھی ہو۔ چنانچہ یہ ایک اعتبار سے دائن اور ایک اعتبار سے حصہ دار ہوتی ہے۔

کمپنی کا انتظامی ڈھانچہ

کمپنی ایک قانونی شخص ہے جو وجود میں آنے کے بعد کاروبار کرے گا' مگر چونکہ یہ حقیقی شخص نہیں' لہذا اس قانونی شخص کی نمائندگی کے لئے حصہ داروں میں سے ہی چند افراد پر مشتمل ایک مجلس بنائی جاتی ہے جو کاروبار کرتی ہے۔ اس کو "مجلس الادارہ" (Board of Directors) کہتے ہیں۔

اس کا انتخاب تمام شیئر ہولڈرز کی ووٹنگ سے ہوتا ہے۔ پھر یہ بورڈ آف ڈائریکٹرز اپنے میں سے ایک کو سربراہ ادارہ منتخب کرتا ہے۔ اس کو "العضو المنتدب" (Chief Executive) کہتے ہیں۔

یہ چیف ایگزیکٹو بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے بھی ہوسکتا ہے' اور باہر سے بھی کسی کو ملازم رکھا جاسکتا ہے۔ یہ بورڈ کی پالیسی کے ماتحت عملاً کام کرتا ہے۔

تمام شیئر ہولڈرز کا ایک سالانہ اجتماع ہوتا ہے جس کو "الجمعیة العمومیة السنویة" (Annual General Meeting) کہتے ہیں۔ اسی کا مخفف نام اے' جی' ایم (A.G.M) ہے۔ اس میں کاروبار کی پالیسی' اکاؤنٹس' (حسابات) اور آڈٹ رپورٹ وغیرہ پیش کی جاتی ہیں۔ آئندہ کیلئے ڈائریکٹران کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہر حصے کا ایک ووٹ ہوتا ہے' مثلاً کسی کے پاس دس شیئرز ہیں تو اس کے دس ووٹ ہوں گے۔ سالانہ اجتماع میں ووٹ دینے کے بعد شیئر ہولڈرز کا کمپنی کے کاروبار میں کوئی عمل' دخل نہیں ہوتا ہے۔

کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد ختم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو اے' جی' ایم میں کمپنی کے تحلیل ہونے کا فیصلہ ہوجائے یا کمپنی دیوالیہ ہوجائے اور اس کے دیون اثاثوں سے بڑھ جائیں۔ ان دونوں صورتوں میں متعلقہ قانونی ادارے سے کمپنی ختم کرنے کی اجازت لینا ضروری ہے' قانونی اجازت لئے بغیر کمپنی کا وجود ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اور عموماً ایسی صورت میں حکومت کی طرف سے کمپنی کے اثاثوں کو قرض خواہوں یا حصہ داروں میں تقسیم کرنے کیلئے ایک منتظم مقرر کیا جاتا ہے جسے "ریسیور" (Receiver) یا تحلیل کنندہ (Liquidator) کہتے ہیں۔

منافع کی تقسیم

کمپنی سال بھر کاروبار کرنے کے بعد سالانہ نفع کا حساب لگاتی ہے اور یہ طے کرتی

ہے کہ کتنا نفع ہوا؟ اس کے بعد اس منافع کا کچھ حصہ بطور احتیاط کے محفوظ کر لیتی ہے، تا کہ آئندہ کمپنی کو کوئی نقصان ہو تو اس سے اس کا تدارک کیا جا سکے اس کو عربی میں "احتیاطی" اور انگریزی میں Reserve کہتے ہیں۔ اس احتیاطی نفع کا تعین عموماً بورڈ آف ڈائریکٹرز کرتا ہے۔ اور قانوناً بھی اس کی تحدید ہوتی ہے، اس لئے کہ احتیاطی نفع منہا کر کے باقی نفع پر ٹیکس لگتا ہے، خطرہ ہے کہ ٹیکس سے بچاؤ کے لئے کوئی کمپنی زیادہ نفع احتیاطی میں رکھ لے، اس لئے قانوناً بھی اس کی تحدید ہوتی ہے۔

احتیاطی نکالنے کے بعد بقیہ نفع شیئر ہولڈرز میں تقسیم ہوتا ہے۔ اب کمپنی کو جو دراصل نفع ہوا ہے وہ "الربح" نفع (Profit) ہے اور جو بطور احتیاط رکھا گیا ہے وہ "احتیاطی" یا محفوظ فنڈ (Reserve) ہے باقی نفع جو تقسیم ہو گا وہ "الربح الموزّع" (Dividend) ہے۔ Profit پرافٹ اور Dividend ڈیویڈنڈ میں فرق یہ ہے کہ کل نفع پرافٹ ہے اور احتیاطی نکالنے کے بعد جو تقسیم ہو گا وہ ڈیویڈنڈ ہے پرافٹ شخص قانونی کمپنی کا نفع ہے اور ڈیویڈنڈ شیئر ہولڈرز کا۔

(Dividend) کی تقسیم کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ کبھی تو نقد نفع لوگوں کو فراہم کر دیا جاتا ہے۔ کبھی اس نفع کے دوبارہ حصص (شیئرز) جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے حصے کو "بونس شیئر" (Bonus Share) کہتے ہیں۔ بونس شیئر جاری کرنے سے کمپنی کا سرمایہ بڑھ جاتا ہے۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے، جب کہ کمپنی کی کیش پوزیشن کمزور ہو، یعنی اس کے پاس نقد رقم کم ہو تو بجائے نقد نفع دینے کے مزید حصص جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ کسی حصہ دار کو مثلاً دس روپے دینے کے بجائے دس روپے کا حصہ دیدیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہو گا کہ "منظور شدہ سرمایہ" میں اس کی گنجائش ہو۔ مثلاً ۸ ملین کی اجازت ملی تھی، ان میں سے ابھی تک ۶ ملین جاری کئے تھے، ۲ ملین کی گنجائش ہے، اگر منظور شدہ سرمائے میں مزید گنجائش نہیں ہے تو دوبارہ درخواست دے کر اجازت لی جائے گی ——— بونس شیئرز جاری کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کمپنی کے شیئرز کی بازاری قیمت (Market Value) قيمة اسمية (Face Value) سے کم نہ ہو۔ اگر بازار میں قیمت گر گئی ہے تو اب بونس شیئرز جاری کرنے میں حصہ داران (شیئر ہولڈرز) کا نقصان ہے۔ مثلاً دس روپے کے شیئر کی قیمت بازار میں ۹ روپے ہے تو حصہ دار کو دس روپے کی بجائے ۹ روپے کا شیئر ملے گا تو اس کو ایک روپیہ کا نقصان ہوا۔

"لمیٹڈ" کمپنی کا تصور

لمیٹڈ کمپنی کو "الشركة المحدودة" کہتے ہیں۔ اس سے مراد مسئولیة

(Liability) یعنی ذمہ داری کا محدود ہوتا ہے۔لمیٹڈ کمپنی کے حاملانِ حصص کی ذمہ داری ان کے لگائے ہوئے سرمائے کی حد تک محدود ہوتی ہے۔یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہ ہو گا کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا۔اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہو گیا تو حاملانِ حصص سے ان کے لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہو گا۔اسی طرح کمپنی کی ذمہ داری بھی اس کے اثاثوں کی حد تک محدود ہوگی۔قرضے ادا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کمپنی کے اثاثے قرقی کرائے جاسکتے ہیں اثاثوں سے زیادہ مطالبہ نہیں ہو گا۔اسی لئے لیمٹڈ کمپنی کے ساتھ "لیمٹڈ" لکھنا ضروری ہے 'تاکہ قرض دینے والا اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرض دے کہ اس مدیون کی ذمہ داری محدود ہوگی۔

عام طور پر تو کمپنیاں ہی لیمٹڈ ہوتی ہیں 'لیکن کبھی شرکت (Partner Ship) بھی لیمٹڈ ہوتی ہے۔

پرائیویٹ کمپنی

کمپنی کی دو قسمیں ہیں (۱) پبلک کمپنی (شرکۃ عامۃ) (۲) پرائیویٹ کمپنی (شرکۃ خاصۃ) اب تک جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں وہ "پبلک کمپنی" کی ہیں۔پرائیویٹ کمپنی بھی ایک شخصِ قانونی ہوتا ہے 'مگر اس کے شرکاء کی تعداد محدود ہوتی ہے ' (مثلاً ہمارے یہاں کم از کم ۲ اور زیادہ سے زیادہ ۵۰ شرکاء ہوسکتے ہیں)۔یہاں سرمائے کے حصص جاری نہیں کئے جاتے ہیں 'پراسپکٹس نہیں شائع کیا جاتا ہے 'اسکے شیئرز بازار حصص (اسٹاک ایکسچینج) میں فروخت نہیں ہوتے ہیں --------- قانونی تقاضا ہے کہ پرائیویٹ کمپنی کے ساتھ پرائیویٹ لکھنا ضروری ہوتا ہے۔

شرکت اور کمپنی میں فرق

شرکت (Partner Ship) کو عربی میں "الشرکۃ" (بکسر الشین وسکون الراء) یا "شرکۃ الاشخاص" کہتے ہیں۔اور کمپنی کو شرکۃ المساھمۃ (بفتح الشین وکسر الراء) کہتے ہیں۔شرکت اور کمپنی میں کئی امتیازی فرق ہیں۔

(۱) شرکت میں ہر شخص کاروبار کے تمام اثاثوں کا مشاع طور پر مالک ہوتا ہے۔ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے 'ہر شخص کی ذمہ داری یکساں ہوتی ہے 'مثلاً کوئی دین واجب ہوا تو تمام شرکاء سے برابر درجے میں مسئولیت ہوگی 'مگر کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا۔ کمپنی ایک "شخصِ قانونی" ہے اس کا الگ وجود ہے اور حصہ داران کا الگ وجود ہے 'حاملینِ حصص اس حد تک تو کمپنی کے اثاثوں میں شریک ہیں کہ اگر کمپنی تحلیل ہو اور اسکے اثاثے تقسیم ہوں تو ان کو متناسب حصے ملیں گے 'لیکن کمپنی کی تحلیل سے پہلے قانون حاملِ حصص کا یہ حق

تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کمپنی کے اثاثوں میں تصرف کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حاملِ حصص مدیون ہو اور اس کے اثاثے قرق کئے جائیں تو جو شیئرز اس کے ہاتھ میں ہیں وہ تو قرق ہوں گے مگر اس کے شیئر کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں میں سے اس کا جو حصہ بنتا ہے وہ قرق نہیں ہوگا' اس لئے کہ قانوناً کمپنی کے اثاثوں پر اسکو تصرف کا حق نہیں ہے۔

(۲) شرکت میں کاروبار کی طرف سے کسی پر دعویٰ ہو یا کسی کی طرف سے کاروبار پر دعویٰ ہو تو تمام شرکاء مدعی یا مدعیٰ علیہ ہوں گے۔ مگر کمپنی خود ایک شخص قانونی ہے' لہٰذا کمپنی خود ہی مدعی یا مدعیٰ علیہ ہوگی' حاملین حصص (شیئر ہولڈرز) نہیں ہوں گے۔ اس شخصِ قانونی کی نمائندگی عدالت میں انتظامیہ کا کوئی فرد کریگا۔

(۳) شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا' کمپنی کا الگ سے قانونی وجود ہوتا ہے' جس کو "شخص قانونی" کہتے ہیں۔

(۴) شرکت میں کوئی شریک شرکت فسخ کر کے اپنا سرمایہ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے' مگر کمپنی میں سے اپنا سرمایہ نہیں نکالا جاسکتا' البتہ شیئرز فروخت کئے جاسکتے ہیں۔

(۵) شرکت میں عموماً ذمہ داری کاروبار کے اثاثوں تک محدود نہیں ہوتی' کمپنی میں ذمہ داری محدود ہوتی ہے۔

کمپنی کے لئے فنڈز کی فراہمی

کمپنی میں ابتداءً کچھ سرمایہ (Sponsers) یعنی کمپنی بنانے والوں کی طرف سے ہوتا ہے' سرمائے کا بہت سا حصہ اجراء حصص کے ذریعے عوام سے حاصل کیا جاتا ہے' مگر عموماً یہ سرمایہ کمپنی کے لئے کافی نہیں ہوتا' وقتاً فوقتاً مزید سرمایہ حاصل کرنے کی ضرورت بھی پیش آتی رہتی ہے۔ اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

(الف)۔۔۔۔۔ کبھی مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لئے کمپنی مزید حصص جاری کرتی ہے۔ جب کہ منظور شدہ (Authorised) سرمایہ میں اس کی گنجائش ہو یا دوبارہ اجازت لی جائے۔ یہ حصص جواب جاری کئے گئے ہیں' ان میں قدیم حصہ داران (شیئر ہولڈرز) کا ترجیحی حق ہوتا ہے کہ اگر وہ نئے حصص لینا چاہیں تو لے لیں۔ جن نئے حصص میں پرانے حصہ داروں کو ترجیحی حق ہوتا ہے انکو "سہام الاولویۃ" (Right Shares) کہتے ہیں۔

یہ حق شفعہ سے ملتا جلتا ہے۔ اسکے قدیم حصہ داران کو دو فائدے ہوتے ہیں۔

(الف) عموماً کمپنی کا کاروبار شروع ہونے کے بعد شیئر کی بازاری قیمت (Market Value) لکھی ہوئی قیمت (Face Value) سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے خریدنے میں نفع ہوتا ہے۔ اس نفع کے لینے کا حق پہلے قدیم حصہ داران کو دیا جاتا ہے۔ مثلاً لکھی ہوئی قیمت ۱۰ روپے اور بازاری قیمت ۲۰ روپے ہے تو شیئر دس روپے میں ملے گا مگر فروخت ہوگا ۲۰

ہیں روپے میں، لہٰذا شیئر لینے والے کو دس روپے کا نفع ہوگا۔ (ب) دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مزید سرمائے کے حصص جاری کرنے سے حصہ داران کی شرکت کی نسبت میں کمی آجاتی ہے۔ ان کو اپنی نسبت بحال کرنے کے لئے نئے شیئرز خریدنے کا ترجیحی حق دیا جاتا ہے۔ مثلاً پہلے کمپنی میں ایک لاکھ روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا، جس میں سے کسی نے دو ہزار روپے کے شیئرز لئے تھے، تو اس کی شرکت کی نسبت دو فیصد ہے۔ اب جب کمپنی ایک لاکھ کے مزید حصص جاری کرے گی تو اب کمپنی کا سرمایہ دو لاکھ ہو گیا۔ ۲ ہزار کی نسبت ۲ لاکھ سے ۱% فیصد رہ جائے گی۔ اس لئے اس کو حق دیا گیا ہے کہ مزید دو ہزار کے شیئرز لے کر دوبارہ نسبت دو فیصد کرلے۔

(۲)—— مزید حصص جاری کرنے میں کچھ مشکلات بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً سرمائے کی منظوری کی حدود وقیود ہوتی ہیں، حصہ داران میں اضافہ ہوجاتا ہے اور ان کا کمپنی پر کنٹرول ہوتا ہے۔ اس جیسی مشکلات کی وجہ سے بہت سے کمپنیاں مزید حصص جاری کرنے کا طریقہ پسند نہیں کرتیں، بلکہ مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لئے قرض لیتی ہیں۔ قرض لینے کی دو صورتیں ہیں۔

الف)—— بنک یا کسی مالیاتی ادارے سے قرض لیا جاتا ہے۔ جو عموماً سود پر لیا جاتا ہے۔

ب)—— عوام کو شیئرز لینے کی نہیں، بلکہ قرضے دینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس کے لئے دو طرح کی دستاویزات کمپنی جاری کرتی ہے، جس کو لے کر لوگ قرضے دیتے ہیں۔

۱)—— سند (Bond) (بانڈ)

بانڈ معینہ مدت کے لئے جاری ہوتا ہے۔ اس وقت تک اس پر سالانہ سود ملتا رہتا ہے۔ مدت کبھی زیادہ ہوتی ہے، کبھی کم، ایسا بھی ہوا ہے کہ بانڈز ننانوے سال کے لئے جاری ہوئے۔ بانڈز کا حامل مدت پوری ہونے سے پہلے اس کو فروخت بھی کر سکتا ہے۔

۲)—— "شہادۃ الاستثمار" (Debenture) (ڈیبنچر)

بانڈ اور ڈیبنچر میں اتنی بات قدر مشترک ہے کہ ان دونوں کا حامل کمپنی میں حصہ دار نہیں ہوتا، محض دائن ہوتا ہے جس کو کمپنی کی طرف سے سالانہ سود دیا جاتا ہے اور وقت مقرر پر رقم واپس کر دی جاتی ہے۔ اور ان دونوں میں فرق دو طرح سے ہے۔ ایک تو یہ کہ بانڈ صرف قرضے کی دستاویز ہے اب بعض اوقات قرضوں کے بانڈز کو تحفظ دینے کے لئے ایک دستاویز جاری کی جاتی ہے، جس میں ان بانڈز کو کمپنی کی کسی ایک جائیداد یا بہت سی جائیدادوں کے ساتھ متعلق کر دیا جاتا ہے کہ اگر یہ قرضے ادا نہ ہوئے تو ان جائیدادوں سے ادا کر دیئے جائیں گے۔ اس کو (Debenture) کہتے ہیں۔ گویا بانڈ قرضے کی دستاویز ہے اور ڈیبنچر اس کے رہن کا وثیقہ ہے—— دوسرا فرق یہ ہے کہ اگر کمپنی دیوالیہ

ہو جائے تو اثاثوں سے جن لوگوں کا حق متعلق ہوتا ہے' ان کے حقوق کی ادائیگی کی قانوناً ترتیب ہوتی ہے' اس ترتیب میں ڈیبنچر اس جائیداد کی حد تک مقدم ہوتا ہے جس کو رہن بنایا گیا تھا' بانڈز کی ادائیگی اس کے بعد ہوتی ہے۔

بانڈ کی ایک قسم ایسی ہے' جس میں حامل کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ بانڈ کو شیئر میں تبدیل کرلے۔ پہلے وہ دائن تھا' اب وہ کمپنی میں حصہ دار ہوگا۔ اس کے لئے کبھی مدت مقرر ہوتی ہے کہ اتنی مدت کے بعد شیئر میں بدل سکتے ہیں اور کبھی مدت مقرر نہیں ہوتی' کبھی مخصوص شرائط ہوتی ہیں' کبھی نہیں۔ ایسے بانڈز کو "سندات قابلة للتحويل" (Conver- -tible Bonds) کہتے ہیں۔

۳)۔۔۔ "اجارہ" سرمایہ حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور رائج ہوا ہے جس کو "اجارہ" (Leasing) کہتے ہیں۔ اجارہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک (Opearting Leas) (آپریٹنگ لیز) یہ وہ اجارہ ہے جو عام طور پر معروف ہے' اس میں واقعتاً فریقین میں موجر و مستاجر کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ اجارہ سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ دوسری قسم کا اجارہ ہے' جس کو (Financial Lease) (فنانشل لیز) کہتے ہیں۔ اسکی وضاحت یہ ہے کہ یہاں اصل مقصود اجارے کا رشتہ قائم کرنا نہیں ہوتا' بلکہ کمپنی کو جامد اثاثوں کی (مثلاً مشینری کی) ضرورت ہے تو کمپنی بنک سے قرض لے کر خود مشینری خریدنے کی بجائے کسی بنک یا مالیاتی ادارے کو یہ کہتی ہے کہ یہ مشینری خرید کر ہمیں کرایہ پر دیدو۔ اس دوران مشینری کا مالک بنک یا مالیاتی ادارہ ہوگا اور کمپنی کرایہ دار ہونے کی حیثیت سے اسے استعمال کرتی ہے ایک مخصوص مدت کے لئے کرایہ اس تناسب سے طے کیا جاتا ہے کہ اس میں مشینری کی قیمت بھی وصول ہو جائے اور اتنی مدت کے لئے اگر یہ رقم قرض دی جاتی تو اس پر جتنا سود ملنا تھا وہ بھی وصول ہو جائے۔ جب یہ مدت گزر جاتی ہے اور کرایہ کی شکل میں مشینری کی قیمت بمعہ معینہ شرح سود ادا ہو جاتی ہے تو اب یہ مشینری خود بخود کمپنی کی مملوک بن جاتی ہے' یہ بات کبھی معاہدے میں لکھی ہوتی ہے اور کبھی لکھی تو نہیں جاتی' مگر معروف اسی طرح ہے۔

قرض کی بجائے اجارے کا یہ طریقہ اختیار کرنے کے دو مقصد ہوتے ہیں۔

۱)۔۔۔ اسکی وجہ سے بعض صورتوں میں ٹیکس سے بچت ہو جاتی ہے یا ٹیکس میں کمی ہو جاتی ہے۔

۲)۔۔۔ قرض کی وصولیابی کے لئے اجارے کا طریقہ بہ نسبت اقراض کے زیادہ باعث اعتماد ہے' اس لئے کہ اجارے میں مشینری موجر کی ملکیت میں ہوتی ہے' اس پر اسی کا لیبل لگا رہتا

ہے' اگر بالفرض رقم نہ ملی تو موجر کو کوئی خطرہ نہیں' اس لئے کہ مشینری اسی کی ملکیت میں ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ فنانشل لیزنگ سے چونکہ ایک درجے میں سرمایہ حاصل کرنے میں مدد لینا ہی مقصود ہوتا ہے' اسلئے اس کو نقد زر کی فراہمی کا ایک طریقہ شمار کر کے اس کو "تمویل" (Financing) کے ذیل میں لایا گیا ہے' ورنہ حقیقت میں یہ "تمویل" (Financing) نہیں ہے' اسلئے کہ تمویل وہ ہوتی ہے جس میں کوئی چیز کمپنی کی ملک میں آجائے اور یہاں وہ مشینری ابھی کمپنی کی ملکیت میں نہیں آئی۔

کمپنی کے حسابات

ہر کمپنی اپنے حسابات باقاعدہ رکھنے کا اہتمام بھی کرتی ہے' حسابات رکھنے کے اصول بھی ہوتے ہیں۔ حسابات رکھنا ایک باقاعدہ فن ہے۔ اس کا اجمالی تعارف بھی ضروری ہے' اس لئے کہ معاملات کو سمجھنے کے لئے اسکی بھی کافی ضرورت پڑتی ہے۔

تختہ توازن (Balance Sheet)

کمپنی کی املاک کو اردو میں "اثاثے" عربی میں "موجودات" یا "اصول" اور انگریزی میں (Assets) کہتے ہیں۔ اور دوسروں کے جو حقوق کمپنی کے ذمہ واجب ہوتے ہیں ان کو "ذمہ داریاں" اور عربی میں "دیون" یا "حقوق" یا "مطلوبات" اور انگریزی میں (Liabilities) کہتے ہیں۔

کمپنی سال میں ایک بار یا کسی معینہ تجارتی دورانیہ میں اپنی ذمہ داریوں اور اثاثوں کی تفصیل تیار کرتی ہے اسکو "تختہ توازن" "لائحة الرصيد" (Balance Sheet) کہتے ہیں۔ بیلنس شیٹ کا اجمالی تعارف یہ ہے کہ ایک طرف کمپنی کے اثاثے اور دوسری طرف ذمہ داریاں لکھ لی جاتی ہیں "اثاثوں" سے مراد کمپنی کی املاک اور واجب الوصول (Receivable) اموال ہیں' اور ذمہ داریوں سے مراد وہ مالی واجبات ہیں جو کمپنی کے ذمے دوسروں کے لئے واجب الادا ہیں پھر ان دونوں میں تناسب دیکھا جاتا ہے۔ اور اس تناسب کی بنیاد پر کمپنی کا استحکام معلوم کیا جاتا ہے۔

ذمہ داریوں اور اثاثوں میں کیا تناسب ہونا چاہئے؟ اس کے بارے میں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر ایک اور دو کی نسبت ہو یعنی اثاثے ذمہ داریوں کے مقابلے میں دوگنے ہوں تو کمپنی خوب مستحکم سمجھی جاتی ہے چنانچہ ایسی کمپنی کو بنک وغیرہ قرض دینے کے لئے زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔

بیلنس شیٹ تیار کرنے کے طریقے کی کچھ وضاحت یہ ہے کہ ایک طرف درج

ذیل طریقے سے کمپنی کے اثاثے لکھے جاتے ہیں۔

اثاثے

اس کو عربی میں "موجودات" اور انگریزی میں (Assets) کہتے ہیں۔
اثاثے تین قسم کے لکھے جاتے ہیں۔

۱) ---رواں اثاثے (Current Assets) انکو عربی میں "موجودات متداولۃ" کہتے ہیں۔ جو نقد ہوں یا بسہولت نقد پذیر ہوں۔ اس میں یہ چار مدات شامل ہوتی ہیں۔ (الف) نقد (Cash) (ب) کمپنی نے جو رقم کسی سے وصول کرنی ہے (Accounts Receivable) مثلاً کوئی چیز فروخت کی ہے، اس کی قیمت ابھی قابل وصول ہے (ج) اگر کمپنی نے دوسرے اداروں کو قرض دیکر اس کی دستاویزات اور رسید یں اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں تو وہ بھی اس کے اثاثوں میں شمار ہیں مثلاً بانڈز وغیرہ اس کو (Notes Receivable) کہتے ہیں۔ (د) کسی اور کمپنی یا ادارے میں سرمایہ کاری کی گئی ہے اور وہاں سے رقوم کی وصولی متوقع ہے (Investments)

۲) ---جامد اثاثے (Fixed Assets) ان کو عربی میں "موجودات ثابتۃ" کہتے ہیں۔ ان سے مراد غیر نقد اثاثے ہیں جو جلدی نقد پذیر نہیں۔ جیسے مشینری، بلڈنگ وغیرہ۔

۳) --- غیر مادی اثاثے (Intangible Assets) انکو عربی میں "موجودات غیر مادیۃ" کہتے ہیں۔ ایسے اثاثے جن کو مادی طور پر محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے گڈول، اس کی قیمت بھی لگتی ہے۔ بیع و شراء بھی ہوتی ہے مگر یہ کوئی محسوس مادی چیز نہیں، یا کسی تجارت کی ایڈورٹائزنگ (تشہیر) پر رقم خرچ ہوئی، اس تشہیر کا کئی سال تک فائدہ ہوگا۔ یہ بھی غیر مادی اثاثوں میں شامل ہوگی۔

اثاثے لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ یہ اثاثے کن ذرائع سے حاصل ہوئے ان کے لئے سرمائے کا حصول (Financing) کہاں سے ہوئی۔

اثاثوں کی قیمتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک وہ قیمت جو بوقت خرید تھی، پھر استعمال کے بعد فرسودگی کی وجہ سے اس کی قیمت کم ہوجاتی ہے، زمانہ گزرنے سے قیمت میں اضافہ بھی ہوتا ہے، لیکن چونکہ قیمت کے اس تغیر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مشکل ہوتا ہے اس لئے بیلنس شیٹ میں اثاثوں کی وہ قیمت لگائی جاتی ہے جس پر وہ اصلاً خریدے گئے تھے۔ اس کو "کتابی قیمت" یا (Book Value) کہا جاتا ہے چونکہ ان اثاثوں کی موجودہ بازاری قیمت عموماً مختلف ہوتی ہے اس لئے عموماً بیلنس شیٹ سے کمپنی کی صورتحال کی حقیقی نمائندگی نہیں ہوتی، بلکہ ظنی اور تقریبی ہوتی ہے۔ اس میں دھوکہ بھی چلتا ہے۔

ذمہ داریاں

بیلنس شیٹ کے دوسرے حصہ میں "ذمہ داریاں" لکھی جاتی ہیں۔ یعنی وہ یہ رقوم ہیں جو کمپنی پر واجب الادا ہیں، اور کمپنی کو ادا کرنی ہیں۔ ذمہ داریوں میں ملازمین کی تنخواہیں جو دینی ہیں، کوئی چیز خریدی ہے اس کی قیمت واجب الادا ہے، سرمایہ لیا ہے وہ واجب الاداء ہے، اس جیسی چیزیں داخل ہیں۔ ذمہ داریاں لکھنے کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے طویل المیعاد ذمہ داریاں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً قرض لیا ہے جو پانچ سال کے بعد ادا کرنا ہے۔ ایسی ذمہ داریوں کو (Long Term Liabilities) کہتے ہیں۔ اس کے بعد "رواں ذمہ داریاں" لکھی جاتی ہیں، جو تھوڑی مدت میں ادا کرنی ہیں، مثلاً ملازمین کی تنخواہ، ٹیکس، کوئی چیز خریدی ہے اس کا بل ادا کرنا ہے، طویل المیعاد قرضوں کا وہ حصہ جو ایک سال کے اندر ادا کرنا ہے۔ ایسی ذمہ داریوں کو (Current Liabilities) کہتے ہیں۔

صافی مالیت

اثاثوں میں سے ذمہ داریاں منہا کر کے جو باقی بچے اس کو "صافی مالیت" "المالیة الصافية" (Net Worth) کہتے ہیں۔ یہی مالیت دراصل حصہ داروں کی ملکیت ہوتی ہے۔

نفع، نقصان کا میزانیہ

تختہ توازن (بیلنس شیٹ) تو کمپنی کا مالی استحکام معلوم کرنے کے لئے ہوتی ہے، اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ کمپنی کو کتنا نفع یا کتنا نقصان ہوا؟ نفع، نقصان کو بیان کرنے کے لئے جو رپورٹ تیار کی جاتی ہے اس کو عربی میں "اللائحة المالية" یا "البيان المالي" اور انگریزی میں (Income Statement) کہتے ہیں۔ اس کی ترتیب یہ ہوتی ہے۔

مجموعی فروختگی،	(Gross Sales)
- واپسی،	(Returns)
= صافی فروختگی،	(Net Sales)
- براہ راست اخراجات،	(Direct Expenses)
= اجمالی منافع،	(Gross Profit)
- بالواسطہ اخراجات،	(Indirect Expenses)
= صافی منافع (قبل ٹیکس)،	(Net Profit (Pre Tax))
- ٹیکس،	(Tax)

= صافی منافع (بعد ٹیکس) (Net Profit (After Tax))

- محفوظ فنڈ (Reserve)

= منافع قابل تقسیم (Dividend)

"واپسی" سے مراد وہ اشیاء ہیں جو بیچنے کے بعد واپس لینی پڑتی ہیں۔ وہ چونکہ فروختگی میں شامل ہو چکی ہیں اس لئے ان کو منہا کر کے جو فروختگی بچے گی وہ "صافی فروختگی" ہے۔ "براہ راست اخراجات" سے مراد وہ اخراجات ہیں جو اس چیز کی تیاری پر ہوتے ہیں جو کمپنی کا اصل سامان تجارت ہے، مثلاً اگر کوئی مل ہے تو اس کے خام مال کی خریداری پر جو اخراجات ہوں گے وہ براہ راست اخراجات میں داخل ہوں گے یا کوئی اخبار نکلتا ہے تو اس کی طباعت اور اس کے کاغذ کے اخراجات اسی مد میں آئینگے۔ "صافی فروختگی" سے یہ اخراجات منہا کر کے جو رقم بچے وہ کمپنی کا "اجمالی نفع" ہے۔ "بالواسطہ اخراجات" سے مراد وہ اخراجات ہیں جن کا تعلق براہ راست اشیاء فروخت کی تیاری سے نہیں ہے مثلاً دفتر کی عمارت کا کرایہ، ایڈیٹر کی تنخواہ وغیرہ۔ "براہ راست اخراجات" اور "بالواسطہ اخراجات" میں عملی فرق یہ ہے کہ براہ راست اخراجات اس وقت ہوں گے جب کہ اشیاء تیار ہوں، اگر اشیاء تیار نہ ہوں تو یہ اخراجات نہیں ہوں گے۔ پھر اشیاء زیادہ تیار ہوں تو خرچہ بھی زیادہ ہو گا کم تیار ہوں تو اخراجات بھی کم ہوں گے۔ اور بالواسطہ اخراجات بہرحال بدستور جاری رہیں گے چاہے پروڈکشن ہو یا نہ ہو کم ہو یا زیادہ۔ "اجمالی نفع" سے اس قسم کے اخراجات منہا ہوں تو بقیہ "صافی نفع" (قبل از ٹیکس) ہے۔ پھر اس میں سے حکومت کو ادا کیا جانے والا ٹیکس منہا ہو کر بقیہ "صافی نفع" (بعد ٹیکس) ہے۔ اس "صافی نفع" کا کچھ حصہ محفوظ فنڈ یا ریزرو میں منتقل کرنے کے بعد جو منافع بچتا ہے، وہ "قابل تقسیم منافع" یا (Distributable Profit) کہلاتا ہے۔

انکم اسٹیٹمنٹ میں جو صافی نفع دکھایا جاتا ہے اس کا کیش کی شکل میں ہونا ضروری نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمپنی نفع بہت دکھاتی ہے مگر اس کے پاس نقد اتنا نہیں ہوتا بلکہ وہ پروڈکشن میں لگا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ہی "بونس شیئر" جاری کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

بازارِ حصص

(Stock Exchange)

کمپنی کے احکام پر غور کرنے کے لئے "بازارِ حصص" کی بنیادی تفصیلات کا معلوم ہونا بھی بہت اہم اور ضروری ہے۔

تعارف و ضرورت

جب کوئی شخص کمپنی کے شیئرز لے کر اس کا حصہ دار بن جائے تو اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی وقت وہ اپنی رقم واپس لے کر شرکت ختم کر سکے۔ بلکہ جب تک کمپنی وجود میں ہے' اس سے حصے کی رقم واپس نہیں لی جا سکتی لیکن چونکہ بہت سے شرکاء یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی شرکت ختم کر کے اپنے حصے کو نقد میں تبدیل کر لیں' اس لئے یہ ضمانت فراہم کرنا ضروری تھا کہ رقم لگانے کے بعد بوقت ضرورت اپنے شیئرز کو نقد میں تبدیل کرنا ممکن ہو گا' اس کے لئے "بازارِ حصص" قائم کیا گیا' جس میں شیئرز بیچے جا سکتے ہیں۔ یعنی کمپنی کے حصہ دار اپنی شرکت ختم کر کے کمپنی سے تو اپنا سرمایہ واپس نہیں لے سکتے لیکن بازارِ حصص میں وہ اپنا حصہ کسی اور کو بیچ سکتے ہیں جس کے نتیجے میں خریدار ان کی جگہ کمپنی کا حصہ دار بن جاتا ہے جس جگہ شیئرز کی خرید و فروخت ہوتی ہے اس کو "بازارِ حصص" (Stock Market) کہتے ہیں۔

شیئرز کی خرید و فروخت کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ دو شخص کسی ادارے کے توسط کے بغیر شیئرز کی خرید و فروخت کریں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی ادارے کے توسط سے شیئرز کی خرید و فروخت ہو۔ وہ ادارہ "اسٹاک ایکسچینج" ہے جو شیئرز کی خرید و فروخت کی نگرانی بھی کرتا ہے اور واسطہ بھی بنتا ہے۔ اس کو عربی میں "بورصہ" کہتے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کے توسط کے بغیر جو شیئرز کا کاروبار ہوتا ہے' اسکو "عملیات من وراء المنصة" (Over The Counter Transactions) کہتے ہیں۔ اس انداز کی خرید و فروخت کا کوئی خاص نظم نہیں' اس کی تفصیلات جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔ جو خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے ہوتی ہے اس کی چند تفصیلات سمجھنا ضروری ہے۔

اسٹاک ایکسچینج ایک پرائیویٹ ادارہ ہوتا ہے۔ جو حکومت کی اجازت و سرپرستی کے ساتھ کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ لیکن اسٹاک ایکسچینج انہی کمپنیوں کے شیئرز کا کاروبار کرتا ہے جو قابل اعتماد ہوں اور کچھ نہ کچھ ساکھ رکھتی ہوں۔ جن کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے ان کو (Listed Companies)

کہتے ہیں۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج میں بھی ہو سکتی ہے اور "اوور دی کاؤنٹر" بھی ہو سکتی ہے۔ کسی کمپنی کی لسٹنگ کبھی اسکے وجود میں آجانے کے بعد ہوتی ہے۔ کبھی کمپنی منظور ہونے کے بعد اس کے کاروبار شروع ہونے سے پہلے' بلکہ کبھی شیئرز فلوٹ ہونے سے بھی پہلے کمپنی کی لسٹنگ ہو جاتی ہے اس کو عبوری (Provisional) لسٹنگ کہتے ہیں۔ اس کا کاؤنٹر بھی الگ ہوتا ہے۔ جن کمپنیوں کے شیئرز اسٹاک ایکسچینج نہیں لیتا ہے ان کو (Unlisted Companies) کہتے ہیں۔ ان کے شیئرز کی خرید و فروخت "اوور دی کاؤنٹر" ہی ہو سکتی ہے اسٹاک ایکسچینج میں نہیں ہو سکتی۔

ممبر شپ

اسٹاک ایکسچینج میں ہر شخص شیئرز کی خرید و فروخت کا کام نہیں کر سکتا اس کے لئے ممبر ہونا ضروری ہے' ممبر شپ کی فیس بھی ہوتی ہے۔ ممبر ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کا کاروبار بہت وسیع' نازک اور فنی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہاں کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں۔ ایک نیا ناتجربہ کار شخص کاروبار میں غلطی بھی کر سکتا ہے۔ اور ادارہ وہاں ہونے والے تمام معاملات میں ادائیگیوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ لہٰذا ادارہ ہر شخص کو خرید و فروخت کی اجازت دے کر اس کے معاملات کا ذمہ دار نہیں بننا چاہتا' اس لئے ممبر ہونا ضروری قرار دیدیا گیا ہے۔

اسٹاک ایکسچینج میں دلالی

اسٹاک ایکسچینج کے ممبر اپنے لئے بھی شیئرز خریدتے ہیں اور بحیثیت دلال کمیشن لے کر دوسروں کے لئے بھی خریدتے ہیں۔ غیر ممبر کو شیئرز خریدنے ہوں تو وہ کسی دلال کے واسطے سے خریدتا ہے۔ شیئرز خریدنے کے لئے دلال کو آرڈر دینے کی تین صورتیں ہیں۔

۱)۔۔۔ مارکیٹ آرڈر۔ (Market Order) یعنی ایسا آرڈر جس میں دلال سے یہ کہہ دیا گیا ہو کہ مارکیٹ میں جو بھی ریٹ ہو اس پر فلاں کمپنی کے شیئرز خرید لئے جائیں۔

۲)۔۔۔ لمیٹڈ آرڈر۔ (Limited Order) یعنی ایک قیمت مقرر کر کے آرڈر دیا جائے کہ اگر قیمت پر شیئرز مل جائیں تو لے لئے جائیں' اس سے زیادہ قیمت پر نہ خریدے جائیں۔

۳)۔۔۔ اسٹاپ آرڈر۔ (Stop Order) یعنی شیئرز کا مالک اپنے شیئرز کی بیع کا مشروط آرڈر دیتا ہے کہ اگر اس کی قیمت بحال رہے یا بڑھتی رہے تو شیئرز نہ بیچنا اور اگر قیمت گرنے لگے تو بیچ دینا۔

شیئرز کی قیمتوں کا تعین

کمپنیوں کے شیئرز کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس میں کمپنی کے اثاثوں کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اثاثے بڑھنے سے قیمت بڑھتی ہے' لیکن اثاثوں کے علاوہ اور کئی خارجی عوامل سے بھی قیمتیں اثر پذیر ہوتی ہیں' مثلاً منافع کے امکانات' طلب و رسد کا رجحان' سیاسی حالات' موسمی حالات' غیر مادی عوامل جیسے بعض افواہوں اور تخمینوں سے بھی قیمتیں اثر پذیر ہوتی ہیں۔ چونکہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ میں خارجی عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں' اس لئے شیئرز کی قیمتیں سے کمپنی کے اثاثوں کی حقیقی نمائندگی نہیں ہوتی ——— کسی کمپنی کے شیئرز کی قیمت بڑھ جائے تو اس شیئر کی مارکیٹ کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں (Bull Market) کہتے ہیں۔ اور قیمت کم ہو جائے تو اسے (Bear Market) کہتے ہیں۔

خریدارِ حصص کی قسمیں

شیئرز خریدنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔

۱)——— بعض لوگ کمپنی میں حصہ دار بننے کے لئے شیئرز خریدتے ہیں اور شیئرز اپنے پاس رکھ کر سالانہ نفع حاصل کرتے ہیں مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

۲)——— اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شیئرز کو بذات خود مال تجارت سمجھ کر اس کی خرید و فروخت کرتے ہیں' جب شیئرز کی قیمت کم ہو اس وقت خریدتے ہیں اور جب قیمت بڑھ جائے تو بیچ دیتے ہیں۔ دونوں قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ ان کا نفع ہوتا ہے۔ قیمتوں کے بڑھنے کی وجہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کو (Capital Gain) کہتے ہیں۔ اس کاروبار میں پہلے تخمینہ اور اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ کونسے شیئرز کی قیمتیں آئندہ کم ہوں گی اور کونسے شیئرز کی قیمتیں بڑھیں گی' اس عمل تخمین کو (Speculation) کہتے ہیں۔ یہ اندازہ کبھی صحیح ثابت ہوتا ہے اور کبھی غلط۔

شیئرز کی خرید و فروخت کا طریق کار

شیئرز کی خریداری کے تین طریقے ہیں۔

۱)——— حاضر سودا :(Spot Sale) یہ خرید و فروخت کا عام سادہ انداز ہے کہ کسی نے شیئرز دے کر ان کی قیمت وصول کرلی۔ اس حاضر سودے میں بھی شیئرز کے سرٹیفکیٹ پر قبضہ عموماً ایک ہفتے کے بعد ہوتا ہے۔

۲) ـــــ (Sale On Margin) : اس سے مراد شیئرز کی ایسی خریداری ہے جس میں شیئرز کی قیمت کا کچھ فیصد حصہ فی الحال ادا کر دیا جائے۔ باقی ادھار ہو۔ مثلاً دس فیصد قیمت ادا کر دی اور ۹۰ فیصد ادھار ہے ـــــــــ اس کی عموماً صورت یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ اکثر شیئرز خریدتے رہتے ہیں ان کے دلالوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ اب کوئی شخص دلال سے کہتا ہے کہ فلاں کمپنی کے شیئرز Margin پر خرید لو جس کی شرح طے کر لی جاتی ہے مثلاً دس فیصد "اتنی رقم تو خریدار دیدیتا ہے" باقی ۹۰ فیصد دلال اپنی طرف سے ادا کرتا ہے۔ یہ رقم دلال کا قرض ہوتا ہے خریدار کے ذمے۔ دلال کبھی اس پر سود لیتا ہے اور کبھی نہیں۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ چند دن تک تو مہلت بلا سود ہے "اس کے بعد سود ادا کرنا ضروری ہوتا ہے مثلاً اگر باقی ماندہ قیمت تین دن تک ادا کر دی تو سود نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے بعد سود لگنے لگا۔ اس میں دلال کا اصل فائدہ کمیشن ہوتا ہے۔ اپنا کاروبار جاری رکھنے کے لئے اور کمیشن ملنے کے لئے وہ قرض دینے کو بھی تیار ہوتا ہے۔

۳) ـــــ (Short Sale) شارٹ سیل در حقیقت "بیع غیر مملوک" کا نام ہے' یعنی بائع ایسے شیئرز فروخت کر دیتا ہے جو ابھی اس کی ملکیت میں نہیں ہوتے۔ لیکن اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ سودا ہو جانے کے بعد میں یہ شیئرز لیکر خریدار کو دیدونگا۔

حاضر اور غائب سودے

شیئرز کے سودے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کو حاضر سودا (Spot Sale) کہتے ہیں اور دوسرے کو غائب سودا (Forward Sale) کہتے ہیں۔

حاضر سودے میں شیئرز کی بیع ابھی ہو جاتی ہے اور حقوق کی منتقلی بھی ابھی ہو جاتی ہے۔ خریدار ابھی سے شیئرز لینے کا حقدار ہوتا ہے "مگر بعض انتظامی مجبوریوں کی بناء پر شیئرز کے سرٹیفکیٹ کی ادائیگی (ڈیلیوری) میں تاخیر ہوتی ہے۔ عموماً ایک سے تین ہفتوں تک تاخیر ہو جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر یہ تاخیر رجسٹرڈ شیئرز کی ادائیگی میں ہوتی ہے جن پر حامل کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔ حامل کا نام بدلنے کے لئے کمپنی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اس کی وجہ سے تاخیر ہو جاتی ہے۔ بیرر شیئرز میں زیادہ تاخیر نہیں ہوتی ہے ـــــــــ حاضر سودے میں بھی چونکہ شیئرز پر قبضہ ہونے میں تاخیر ہو جاتی ہے' اس لئے یہاں بھی خریدار شیئرز کے سرٹیفکیٹ کو اپنی تحویل میں لینے سے پہلے آگے بیچ دیتا ہے۔ بسا اوقات قبضے کا وقت آنے پر اس کی کئی ہاتھوں میں بیع ہو چکی ہوتی ہے۔

حاضر سودے میں شیئرز کی بیع ہو جانے کے بعد قبضے سے پہلے اگر کمپنی نفع تقسیم کر دے تو کمپنی نفع بائع کے نام ہی جاری کرتی ہے' لیکن طریق کار یہی ہے کہ چونکہ بیع ہونے

کے بعد نفع تقسیم ہوا ہے' اس لئے بائع وہ نفع خریدار کو دیدیتا ہے۔

غائب سودے میں بیع تو ابھی ہو جاتی ہے مگر مستقبل کی طرف مضاف ہوتی ہے۔ جیسے ابھی شیئرز کی بیع ہو چکی ہے مگر قبضے وغیرہ کے حقوق فلاں تاریخ سے متعلق ہوں گے۔ غائب سودے میں جب وہ تاریخ آتی ہے جس پر شیئرز کی ادائیگی طے کی گئی تھی تو بعض اوقات شیئرز خریدار کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں' اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بائع اور خریدار شیئرز لینے کے بجائے خریداری کی تاریخ کی قیمت اور ادائیگی کی تاریخ کی قیمت کا فرق آپس میں برابر کر لیتے ہیں۔ مثلاً یکم جنوری کو ۲۰ مارچ کی تاریخ کیلئے غائب سودا کیا گیا تھا' اور فی شیئر دس روپے قیمت مقرر ہوئی تھی۔ لیکن جب ۲۰ مارچ کی تاریخ آئی تو شیئرز کی قیمت بڑھ کر بارہ روپے ہو گئی۔ اب بائع خریدار کو شیئرز دینے کے بجائے دو روپے فی شیئر ادا کر دیتا ہے' یا اگر قیمت آٹھ روپے رہ گئی تو خریدار بجائے اس کہ بائع کو دس روپے دیکر اس سے شیئرز وصول کرے' اسے فی شیئر دو روپے دیدیتا ہے اور شیئرز وصول نہیں کرتا۔ پھر غائب سودے میں سودے کی تاریخ کے بعد ادائیگی کی تاریخ آنے تک بعض اوقات بہت سے سودے ہو جاتے ہیں یعنی پہلا خریدار دوسرے کو' دوسرا تیسرے کو بیچتا رہتا ہے۔ اور بعض اوقات آخر میں سب شیئرز کے لین دین کے بجائے قیمتوں کا فرق برابر کر لیتے ہیں۔

اجناس میں حاضر اور غائب سودے

بعض ممالک میں اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے جیسے شیئرز کے حاضر اور غائب سودے ہوتے ہیں ایسے ہی اجناس اور اشیاء کے بھی حاضر اور غائب سودے ہوتے ہیں۔ یہ سودے چند منتخب بڑی بڑی اجناس میں ہوتے ہیں مثلاً گندم' کپاس وغیرہ۔

اجناس کا حاضر سودا تو یہ ہوتا ہے کہ کسی جنس کی ابھی بیع ہوئی اور حقوق بھی منتقل ہو گئے اور خریدار ابھی سے قبضے کا حقدار قرار پایا۔ کسی انتظامی مجبوری کی بناء پر قبضے میں تاخیر ہو تو وہ الگ بات ہے مگر وہ حقدار قبضے کا بن چکا ہے۔

غائب سودا یہ ہے کہ بیع تو ہو گئی مگر قبضے کے لئے کوئی آئندہ تاریخ مقرر ہو جاتی ہے' اصولی طور پر اسکو (Forward Sale) بھی کہتے ہیں اور (Future Sale) بھی کہتے ہیں۔ مگر آج کل عملی طور پر ان دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ غائب سودے میں اگر جانبین کا مقصد مقررہ تاریخ پر لینا' دینا ہی ہو یعنی مشتری کا مقصد جنس وصول کرنا اور بائع کا مقصد قیمت لینا ہو تو اسکو (Forward Sales) کہتے ہیں۔ اور اگر جانبین کا مقصد مقررہ تاریخ پر لینا' دینا نہ ہو بلکہ جنس کو محض معاملے کی بنیاد کی حیثیت سے اختیار کیا گیا ہو اسکو (Future Sale) کہتے ہیں۔ اور عربی میں اسکو "مستقبلیات" کہتے ہیں۔ اس میں جنس کا لینا مقصود

نہیں ہوتا' بلکہ مقصد دو باتوں میں سے ایک بات ہوتی ہے۔

(۱)۔۔۔۔سٹہ (Speculation): تاریخ مقررہ پر جنس لینے' دینے کی بجائے قیمتوں کا فرق برابر کرکے نفع کمایا جاتا ہے۔ مثلاً یکم دسمبر کو یہ معاملہ طے ہوا کہ یکم جنوری کو کپاس کی سو گانٹھیں ایک لاکھ روپے میں دینی ہوں گی مگر نہ بائع کا مقصد کپاس دینا ہوتا ہے اور نہ مشتری کا مقصد کپاس لینا ہوتا ہے' بلکہ تاریخ آنے پر دونوں آپس میں نفع یا نقصان برابر کر لیتے ہیں۔ اگر یکم جنوری کو سو گانٹھوں کی قیمت ایک لاکھ دس ہزار ہوگئی تو بائع مشتری کو دس ہزار دے کر معاملہ صاف کرلے گا۔ اور اگر یکم جنوری کو قیمت ۹۰ ہزار ہوگئی تو بائع مشتری سے دس ہزار لے کر معاملہ صاف کرلے گا۔

(۲)۔۔۔۔(Futures Sale) کا دوسرا مقصد ممکنہ نقصان سے تحفظ ہوتا ہے۔ اس کو HEDGING کہتے ہیں' عربی میں اس کو "تأمین ضد الخسارۃ" کہا جا سکتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص کسی جنس کا غائب سودا (Forward Sale) کرتا ہے اور اس کا مقصد واقعی جنس وصول کرنا ہی ہوتا ہے' سٹہ مقصود نہیں ہوتا۔ لیکن خریدار یہ خطرہ محسوس کرتا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ تک اس جنس کی قیمت گر گئی تو مجھے نقصان ہوگا وہ اس نقصان سے بچنے کے لئے اسی جنس کو (Futures Market) میں اسی تاریخ کے لئے (Future) پر فروخت کرتا ہے' تاکہ اگر اس جنس کی قیمت گر گئی تو پہلے معاملے میں جتنا نقصان ہوگا اتنا ہی دوسرے معاملے میں وصول ہو جائے گا۔

مثلاً زید نے یکم دسمبر کو کپاس کی سو گانٹھ ایک لاکھ روپے میں خرید میں' قبضہ یکم جنوری کو طے ہوا۔ اس کا خیال یہ ہے کہ یکم جنوری کو کپاس کی سو گانٹھیں لے کر آگے بیچ کر نفع کماؤں گا' مگر خطرہ یہ ہے کہ یکم جنوری کو کپاس کی قیمت گر گئی تو اس کو نقصان ہوگا۔ زید اس نقصان سے بچنے کے لئے یہ کارروائی کرتا ہے کہ کپاس کی سو گانٹھیں یکم جنوری تک ایک لاکھ روپے میں (Futures) مارکیٹ میں خالد کو بیچ دیتا ہے۔ اب اگر یکم جنوری کو سو گانٹھوں کی قیمت ۹۰ ہزار ہوگئی تو زید کو دس ہزار کا خسارہ ہوا۔ مگر اتنی ہی گانٹھیں چونکہ اس نے خالد کو (Futures) کے بازار میں بیچی ہوئی ہیں' اس لئے یکم جنوری کو وہ ۹۰ ہزار میں دوسری گانٹھیں خرید کر خالد کو ایک لاکھ میں فروخت کر دیگا۔ اور اس طرح پہلے معاملے میں زید کو جو دس ہزار کا خسارہ ہوا تھا وہ اس نے خالد کے ساتھ کئے ہوئے معاملے سے وصول کرلیا ۔۔۔۔۔ "فیوچر سیلز" اس طرح نقصان سے بچنے کے لئے بھی ہوتی ہے' اسی کو (Hedging) (ہیجنگ) کہتے ہیں۔

(Futures) وغیرہ کا کاروبار بعض ممالک میں اسٹاک ایکسچینج ہی میں ہوتا ہے اور بعض ممالک میں اس کا الگ بازار ہوتا ہے۔

بیع الخیارات(Options)

کسی خاص چیز کو خاص قیمت پر بیچنے یا خریدنے کے حق کا نام "خیارات" یا Options ہے۔ کوئی شخص دوسرے سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم چاہو گے تو فلاں چیز اتنی قیمت میں اتنی مدت تک میں خریدنے کا معاہدہ کرتا ہوں، تم جب چاہو بیچ سکتے ہو اس کو بیچنے کا آپشن کہتے ہیں۔

Option دینے والا یہ حق دینے پر فیس لیتا ہے۔ Option دینے والا اس مدت میں اس چیز کو اسی قیمت پر خریدنے کا پابند ہوتا ہے، لیکن Option لینے والا بیچنے کا پابند نہیں ہوتا اسی طرح اس کے برعکس بعض اوقات ایک شخص سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں تم سے فلاں چیز فلاں تاریخ تک فلاں نرخ پر بیچنے کی ذمہ داری لیتا ہوں، اس تاریخ تک تم جب چاہو مجھ سے اس نرخ پر یہ چیز خرید لینا۔ یہ خریداری کا آپشن ہے ------- Option کرنسی پر بھی ہوتا ہے اور اجناس پر بھی ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ Option دینے والا لینے والے کو اس کرنسی یا جنس کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے مطمئن کرتا ہے اور یہ اطمینان دلانے پر کمیشن لیتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے ۵۰ روپے کا ایک ڈالر خریدا۔ وہ اس کشمکش میں ہے کہ اگر یہ اپنے پاس رکھوں تو اس کی قیمت گرنے کا احتمال ہے۔ اگر ابھی آگے فروخت کر دوں تو ہو سکتا ہے کہ آئندہ اس کی قیمت بڑھ جائے تو نفع سے محروم رہوں گا۔ اب دوسرا شخص اس کو اطمینان دلاتا ہے کہ ڈالر تم اپنے پاس رکھو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تین ماہ تک یہ ڈالر میں ۵۰ روپے میں خریدوں گا۔ اور اس وعدے پر اتنی فیس لوں گا۔ اس کی وجہ سے وہ شخص قیمت گرنے سے مطمئن رہے گا۔ اگر قیمت بڑھ گئی تو کسی اور کو فروخت کر دے گا، قیمت گر گئی تو Option بیچنے والے کو ۵۰ روپے میں فروخت کر دے گا۔

Option کو مستقل مال تجارت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی آگے بھی بیع ہو جاتی ہے۔ یہ کاروبار دوسرے ممالک میں بہت وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اور اس کی صورتیں روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہیں۔

السوق المالیۃ(Financial Market)

اسٹاک ایکسچینج ایک بڑے بازار کا حصہ ہے جسکو "السوق المالیۃ "Financial Market) یا (Capital Market) کہتے ہیں۔ جس میں صرف کمپنیوں کے شیئرز ہی نہیں، بلکہ دوسرے اداروں (بنک، دیگر مالیاتی ادارے حکومت وغیرہ) کی جاری کردہ مالیاتی دستاویزات کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے۔ گو اس بازار کا کوئی الگ جغرافیائی وجود ضروری نہیں، عملاً یہ سب کام اسٹاک ایکسچینج میں ہی ہو سکتے ہیں، مگر اصطلاح میں اس کا

معنوی تصور ہے۔ اسی Financial Market میں "سرکاری تمسکات" (Government Securities) کی بیع و شراء بھی ہوتی ہے۔ "سرکاری تمسکات" ان دستاویزات کو کہتے ہیں جو حکومت وقتاً فوقتاً عوام سے قرض لینے کے لئے جاری کرتی ہے۔ جب حکومت کے ذرائع آمدنی (ٹیکس وغیرہ) بجٹ کے لئے ناکافی ہوں، تو حکومت یہ مالیاتی دستاویز عوام سے قرض لینے کے لئے جاری کرتی ہے۔ مثلاً

(۱)۔۔۔۔۔ انعامی بانڈ۔ جس میں ہر بانڈ پر تو نفع نہیں ہوتا، تمام بانڈز سے حاصل ہونے والی رقوم پر مجموعی طور پر نفع ہوتا ہے جو قرعہ اندازی سے تقسیم ہوتا ہے۔

(۲)۔۔۔۔۔ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ

(۳)۔۔۔۔۔ خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ

(۴)۔۔۔۔۔ فارن ایکسچینج بیرر سرٹیفکیٹ۔ پہلے عوام کو اپنے پاس فارن ایکسچینج (بیرونی کرنسی) اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کسی کو فارن ایکسچینج کی ضرورت پیش آتی تو اس میں بہت سی قانونی مشکلات ہوتی تھیں۔ اس صورت حال کا ایک نقصان یہ تھا کہ لوگ غیر قانونی ذرائع سے فارن ایکسچینج حاصل کرتے اور اپنے پاس رکھتے تھے۔ دوسرا نقصان یہ تھا کہ لوگ باہر سے فارن ایکسچینج مثلاً ڈالر لاتے تو وہ حکومت کو نہیں دیتے تھے، جب کہ حکومت کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو قانونی شکل دے کر لوگوں سے فارن ایکسچینج بطور قرض لینے کے لئے جو دستاویز حکومت نے جاری کی اس کو "فارن ایکسچینج بیرر سرٹیفکیٹ" (F.E.B.C) کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اس کی شکل یہ ہے کہ حکومت ڈالر لے کر اس وقت کی قیمت کے مطابق پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیتی ہے مثلاً اس وقت ڈالر کی قیمت ۲۵ روپے ہے اور باہر سے آنے والا سو ڈالر لے کر آیا تو حکومت اس سے سو ڈالر لے کر اس کو دو ہزار پانچ سو پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ جاری کرے گی، جس کا مطلب یہ ہو گا کہ حکومت حامل سرٹیفکیٹ کے لئے پاکستانی ڈھائی ہزار روپوں کی مقروض ہے۔

ایف، ای، بی، سی پر سالانہ ۱۲ فیصد اضافہ ملتا ہے۔ اور اس کا حامل جب چاہے یہ سرٹیفکیٹ پیش کر کے دوبارہ ڈالر لے سکتا ہے۔ اور حامل اس سرٹیفکیٹ کو بیچ بھی سکتا ہے۔

یہ تمام سرکاری تمسکات ہیں، ان میں اصل معاملہ تو حکومت اور قرض دہندہ (حامل دستاویز) کے درمیان ہوتا ہے، لیکن عوام کی سہولت کے لئے ان کے بیچنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ (Financial Market) میں ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ حامل دستاویز جب اس کی بیع کرے گا تو اب وہ دائن نہیں رہے گا، اس کا معاملہ حکومت سے ختم ہو جائے گا اور اب خریدار دائن ہو گا اور حکومت کا معاملہ خریدار سے وابستہ ہو جائے گا۔

شیئرز یا قرضے کی دستاویزات جہاں ان کے جاری کنندہ کے بجائے کسی تیسرے شخص کو فروخت کی جائیں' اس بازار کو "ثانوی بازار" (Secondary market) کہا جاتا ہے۔ جن دستاویزات کا کوئی ثانوی بازار ہو' یعنی وہ کسی تیسرے فریق کو بیچی جا سکتی ہوں' ان کو زیادہ پرکشش سمجھا جاتا ہے اور لوگ روپے کے عوض یہ دستاویزات لینے سے اس لئے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کہ جب چاہیں گے انہیں ثانوی بازار میں بیچ کر نقد رقم حاصل کر لیں گے۔

کمپنی پر ایک نظر شرعی حیثیت سے!

اب تک کمپنی کے بارے میں مروّجہ نظام کی تفصیل کا ذکر ہوا ہے۔ کمپنی کی یہ حقیقت معلوم ہونے کے بعد اب اس کی شرعی حیثیت پر گفتگو مناسب ہوگی۔ اس موضوع پر بحث کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک حصّہ اصولی اور بنیادی طور پر کمپنی کے جواز یا عدم جواز کی بحث سے متعلق اور، دوسرا حصّہ کمپنی سے متعلق جزوی مسائل کا ہے۔

جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے تو اتنی بات تو پہلے واضح ہو چکی ہے کہ کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں، ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں، فقہاء نے شرکت کی چار قسمیں ذکر کی ہیں، اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو پانچ قسمیں بن جاتی ہیں۔ کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی بتمام و کمال داخل نہیں، جیسا کہ پہلے شرکت اور کمپنی میں فروق بتائے جا چکے ہیں ——— اب یہاں علمائے معاصرین کے تین نقطۂ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ شرعاً شرکت ان پانچ قسموں میں منحصر ہے اور کمپنی ان میں سے کسی میں بھی بتمام و کمال داخل نہیں، لہٰذا یہ جائز نہیں۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ محض اس بناء پر کہ کمپنی ان پانچ قسموں میں داخل نہیں اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے جو اقسام ذکر کی ہیں وہ منصوص نہیں، بلکہ فقہاء نے شرکت کی مروّجہ صورتوں کا استقراء کر کے اس کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے۔ پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں کہیں یہ تصریح نہیں کہ جو صورت ان اقسام سے خارج ہو وہ جائز نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی۔

تیسرا نقطۂ نظر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ اپنی حقیقی روح کے اعتبار سے کمپنی شرکت عنان میں داخل ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۶۲۳ ج ۳) اگرچہ کمپنی کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو معروف شرکت عنان میں نہیں پائی جاتیں، لیکن ان کی وجہ سے عنان کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ اب کمپنی کی شرعی حیثیت پر گفتگو کیلئے اس کی خصوصیات پر الگ الگ غور کرنا ہوگا کہ وہ شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں؟

ان خصوصیات میں سے اکثر انتظامی نوعیت کی ہیں جو شرعاً قابل اعتراض نہیں۔البتہ کمپنی میں دو چیزیں شرعی اعتبار سے خاص طور پر قابل غور اور باعث تردد ہیں۔ان امور کے بارے میں احقر اپنی ابتک کی سوچ کا حاصل اہل علم کے غور و فکر کے لئے پیش کرتا ہے۔

(۱)——— پہلا مسئلہ یہ ہے کہ شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا مگر کمپنی کا اپنا مستقل قانونی وجود ہوتا ہے جس کو شخص قانونی کہا جاتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ شخص قانونی کا تصور شرعاً درست ہے یا نہیں؟———جائزہ لینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں گو شخص قانونی کی اصطلاح موجود نہیں، لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

"شخص قانونی" کے نظائر

۱) وقف——— اس کے لئے اگرچہ شخص قانونی کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی، مگر حقیقت میں یہ ایک شخص قانونی ہے۔اس لئے کہ وقف مالک ہوتا ہے، مسجد یا وقف کو چندہ دیا جائے یا کوئی اور چیز دی جائے تو وہ چندہ یا دیگر عطیات وقف نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے وقف ہونے کی تصریح نہ کر دی جائے، بلکہ وقف کے مملوک ہوتے ہیں اور وقف مالک ہوتا ہے، وقف دائن بھی ہوتا ہے۔مثلاً کوئی شخص وقف کی زمین کرایہ پر لیتا ہے تو یہ کرایہ وقف کا دین ہے اور وقف دائن ہے۔ایسے ہی وقف مدیون بھی ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص وقف کا ملازم ہے تو اس کی تنخواہ وقف کے ذمے دین ہے، عدالت میں مقدمہ ہو تو وقف مدعی اور مدعیٰ علیہ بھی ہو سکتا ہے، اور متولی اس کی نمائندگی کرتا ہے۔مالک ہونا، دائن ہونا، مدیون ہونا مدعی یا مدعیٰ علیہ ہونا شخص کے اوصاف میں سے ہے۔معلوم ہوا کہ وقف میں شخص قانونی کی خصوصیات تسلیم کی گئی ہیں۔گو فقہاء نے یہ اصطلاح استعمال نہیں کی۔

۲) بیت المال——— بیت المال کے مال سے پوری قوم کا حق تو متعلق ہے، مگر ہر شخص اس مال میں ملک کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اس مال کا مالک بیت المال ہی ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال بھی ایک شخص قانونی ہے بلکہ فقہاء کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کی ہر مد ایک مستقل شخص قانونی ہے۔بیت المال کے دو الگ الگ حصے ہیں۔بیت مال الصدقہ اور بیت مال الخراج، امام زیلعی رحمہ اللہ نے[۱] مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ایک حصے میں مال نہ ہو تو بوقت ضرورت دوسرے حصے سے قرض لیا جا سکتا ہے۔تو اس صورت میں جس حصے سے قرض لیا گیا وہ دائن اور جس حصے کیلئے قرض لیا گیا وہ مدیون ہو گا۔دائن یا مدیون تو

---

[۱] تبیین الحقائق، کتاب السیر، قبیل باب المرتدین ۳: ۲۸۳

شخص ہوا کرتا ہے ' معلوم ہوا کہ بیت المال کو بھی شخص قرض کر لیا گیا ہے ۔

۳) ترکۃ مستغرقۃ بالدین ـــــــ کسی میت کا سارا ترکہ دیون سے مستغرق ہو تو اس صورت میں دائنین کا مدیون نہ میت ہے ' اس لئے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص مدیون نہیں ہوتا اور نہ ورثہ مدیون ہیں ' اس لئے کہ ان کو تو میراث ملی ہی نہیں ۔ لہٰذا یہاں مدیون ترکہ ہو گا جو شخص قانونی ہے ۔

۴) خلطۃ الشیوع ـــــ یہ نظیر حنفیہ کے مذہب کے مطابق نہیں ' بلکہ ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق ہے ' ان کے ہاں مال زکوٰۃ کئی شخصوں میں مشاع طور پر مشترک ہو تو زکوٰۃ انفرادی حصوں پر نہیں ' بلکہ مجموعے پر ہوتی ہے ۔ معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہ کے ہاں مجموعہ ایک شخص قانونی ہے ـــــــ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خلطۃ الشیوع اور کمپنی کے نظام میں یہ فرق ہے کہ خلطۃ الشیوع میں ائمہ ثلاثہ کے ہاں مجموعے پر زکوٰۃ ہوتی ہے ' پھر ہر شریک کی انفرادی ملکیت پر زکوٰۃ نہیں ہوتی ' اور کمپنی کے نظام میں کمپنی پر الگ ٹیکس ہوتا ہے اور شیئرز ہولڈرز پر الگ ٹیکس ہوتا ہے ۔

ان نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص قانونی کا تصور فی نفسہ کوئی ناجائز تصور نہیں ہے ' اور نہ فقہ اسلامی کے لئے کوئی اجنبی تصور ہے ۔ البتہ یہ اصطلاح ضرور نئی ہے ۔

محدود ذمہ داری کی شرعی حیثیت

کمپنی کی دوسری خصوصیت جو شرعی اعتبار سے قابل غور ہے وہ (Limited Liability) یعنی "محدود ذمہ داری" ہے جس کی تشریح پیچھے کی جا چکی ہے ـــــــ اس میں جہاں تک شیئرز ہولڈرز کی محدود ذمہ داری کا تعلق ہے ' اس کی تو شرعی نقطۂ نظر سے ایک نظیر موجود ہے ' اس لئے کہ جب تک رب المال مضارب کو دوسروں سے قرض لینے کی اجازت نہ دے ' مضاربت میں بھی رب المال کی ذمہ داری اس کے سرمائے تک محدود ہوتی ہے ۔ چنانچہ اگر رب المال نے مضارب کو سرمایہ دیا اور مزید قرض لینے کی اجازت نہیں دی ' پھر کاروبار کے نتیجہ میں مضارب پر دیون واجب ہو گئے تو ایسی صورت میں رب المال کا زیادہ سے زیادہ اس کے سرمائے کی حد تک نقصان ہو گا اس سے زیادہ کا رب المال سے مطالبہ نہیں ہو گا ۔ بلکہ اس سے زیادہ کا ذمہ دار مضارب ہو گا کیونکہ اس نے رب المال کی اجازت کے بغیر قرضے لئے ہیں اس لئے وہی ان کا ذمہ دار ہے ۔ ایسے ہی شیئرز ہولڈر جو خود عمل نہ کر رہا ہو تو اس کی ذمہ داری کے محدود ہونے کی شرط مضاربت کے اصول پر صحیح معلوم ہوتی ہے ۔ البتہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تقریباً تمام کمپنیوں کے پراسپکٹس میں یہ بات درج ہوتی ہے کہ کمپنی ضرورت کے مواقع پر بینکوں وغیرہ سے قرض

لے سکے گی۔ اور جو لوگ کمپنی کے شیئر ہولڈرز بنتے ہیں' ان کو یہ بات معلوم ہوتی ہے' لہٰذا جب وہ پراسپکٹس کو دیکھ کر کمپنی کے حصہ دار بنتے ہیں تو ان کی طرف سے گویا معنوی اجازت ہے کہ کاروبار کیلئے قرض لیا جا سکتا ہے' اور جب رب المال مضارب کو قرض کی اجازت دیدے تو اس کی ذمہ داری محدود نہیں رہتی۔ لیکن اس شبہ کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ پراسپکٹس ہی میں یہ بات بھی درج ہوتی ہے کہ شیئر ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ حصہ داروں کی طرف سے کمپنی کو قرض لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم پر ان قرضوں کی ذمہ داری لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ نہ ہو۔ لہٰذا اس کی صحیح نظیر یہ ہے کہ رب المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی اجازت دے کہ اس کی ذمہ داری وہ خود برداشت کرے۔

لیکن یہاں شرعی نقطۂ نظر سے اصل اشکال یہ ہے کہ مضاربت میں رب المال کی ذمہ داری تو محدود ہوتی ہے مگر مضارب کی ذمہ داری محدود نہیں ہوتی' لہٰذا دائنین رب المال کے سرمائے سے زائد دیون مضارب سے وصول کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دائنین کا ذمہ خراب نہیں ہوتا۔ لیکن کمپنی میں ڈائریکٹران کی ذمہ داری بھی محدود ہے اور خود کمپنی جو شخص قانونی ہے اس کی ذمہ داری بھی محدود ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کے اثاثوں سے زائد دائنین کا جو دین ہوگا اس کی وصولیابی کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ دائنین کا ذمہ خراب ہو جائے گا "خراب الذمة" فقہاء کی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دائن کا دین ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہے۔

اسی اشکال کی بناء پر بعض علماء عصر کی رائے یہ ہے کہ محدود ذمہ داری کا تصور شرعاً صحیح نہیں' اس لئے کہ اس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ کم از کم ڈائریکٹران کی ذمہ داری غیر محدود ہونی چاہئے۔ لیکن اس مسئلے کو اگر ایک دوسرے زاویئے سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کمپنی کی محدود ذمہ داری کے تصور کی بنیاد در اصل شخص قانونی کے تصور پر ہے۔ شخص قانونی کو حقیقت ماننے کے بعد محدود ذمہ داری کو ماننا مشکل نہیں رہتا۔ شخص حقیقی مفلس (دیوالیہ) ہو جائے تو دائنین صرف اس کے اثاثوں سے دین وصول کر سکتے ہیں' اس سے مزید کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی تفلیس فرمانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دائنین کو فرمایا تھا "خذوا ما وجدتم، لیس لکم الا ذلک"[۱] البتہ اگر وہ دوبارہ غنی ہو جائے تو اب پھر مطالبہ کیا جا سکتا ہے' لیکن اگر مفلس ہونے کی حالت میں اس کی موت واقع ہو جائے تو "خراب الذمة" ہو جاتا

---

[۱] صحیح مسلم ص ۱۹ ج ۲ ادارة القرآن کتاب باب وضع الجوائح

ہے' ان کے دیون ادا ہونے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ شخص حقیقی اگر مفلس ہو کر مر جائے تو اس کی ذمہ داری اثاثوں تک محدود ہوتی ہے اور دائنین کا ذمہ خراب ہو جاتا ہے۔ جب کمپنی کو بھی شخص مان لیا گیا ہے تو یہ بھی اگر دیوالیہ ہو کر تحلیل ہو جائے تو اس کی ذمہ داری بھی اثاثوں تک محدود ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ کمپنی کا تحلیل ہو جانا ہی اس شخص قانونی کی موت ہے۔

خصوصاً جب کہ کمپنی کیساتھ معاملہ کرنے والا یہ دیکھ کر معاملہ کرتا ہے کہ یہ کمپنی لمیٹڈ ہے' میرا حق صرف اثاثوں کی حد تک محدود ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ لمیٹڈ کمپنی کے ساتھ لمیٹڈ لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ پھر کمپنی کی بیلنس شیٹ بھی شائع ہوتی رہتی ہے۔ قرض دینے والا بیلنس شیٹ کے ذریعے سے کمپنی کا مالی استحکام دیکھ کر قرض دیتا ہے۔ غرضیکہ جو شخص بھی لمیٹڈ کمپنی سے معاملہ کرتا ہے وہ علی بصیرۃ کرتا ہے اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا فراڈ نہیں ہوتا۔ اس لئے اکثر علماء عصر کی رائے یہی ہے کہ محدود ذمہ داری کے تصور کی وجہ سے شرکت کو فاسد نہیں کہا جا سکتا ہے۔

لمیٹڈ کمپنی کی فقہی نظیر

فقہ میں لمیٹڈ کمپنی کی ایک نہایت دلچسپ نظیر موجود ہے' جو لمیٹڈ کمپنی سے بہت ہی قریب ہے۔ وہ "عبد ماذون فی التجارۃ" ہے' یہ اپنے آقا کا مملوک ہوتا ہے اور اس کو آقا کی طرف سے تجارت کی اجازت ہوتی ہے' جو تجارت وہ کرتا ہے وہ بھی مولیٰ کی مملوک ہوتی ہے۔ اس پر اگر دیون واجب ہوں تو وہ اس غلام کی قیمت کی حد تک محدود ہوں گے۔ اس سے زیادہ کا نہ غلام سے مطالبہ ہو سکتا ہے اور نہ مولیٰ سے۔ یہاں بھی دائنین کا ذمہ خراب ہو گیا۔ یہ نظیر لمیٹڈ کمپنی سے زیادہ قریب اس لئے ہے کہ جیسے کمپنی میں شیئر ہولڈرز کے زندہ ہوتے ہوئے ذمہ خراب ہو جاتا ہے' ایسے ہی یہاں بھی مولیٰ کے زندہ ہوتے ہوئے دائنین کا ذمہ خراب ہو جاتا ہے۔

کمپنی کے چند جزوی مسائل

(UnderWriting) کی شرعی حیثیت

"ضمان الاکتتاب" (UnderWriting) کی تشریح شروع میں گزر چکی ہے کہ اس میں کوئی ادارہ نئی قائم ہونے والی کمپنی کے لئے یہ ضمانت لیتا ہے کہ اگر اس کے جاری کردہ شیئرز لوگوں نے نہ لئے تو وہ خود لے لے گا اور اس ضمانت پر اجرت وصول کرتا ہے۔ اس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ Under Writer جو ضمانت لیتا ہے اس

کی حیثیت کیا ہے؟ یہ ضمانت فقہی نقطۂ نظر سے ضمان یا کفالت نہیں ہے' اس لئے کہ کفالت یا ضمانت تو ایسے دین کے بارے میں ہوتی ہے جو واجب ہو۔ شیئرز لینا واجب نہیں اس لئے شیئرز لینے کا ضامن بننا ضمانت یا کفالت نہیں' بلکہ ایک وعدہ ہے یا مالکیہ کی اصطلاح میں اس کو التزام کہا جا سکتا ہے۔ (التزام 'اپنے اوپر کسی چیز کو لازم کرلینا' یہ مالکیہ کے ہاں ایک مستقل باب ہے) اور وعدہ حنفیہ کے ہاں دیانۃً لازم ہوتا ہے 'قضاءً لازم نہیں ہوتا' البتہ مالکیہ کے ہاں بعض صورتوں میں لازم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مالکیہ کا قول اختیار کرتے ہوئے یہ وعدہ لازم ہو گا۔

دوسرا مسئلہ اس کمیشن کا ہے جو(Under Writing) پر لیا جاتا ہے۔ اس کمیشن کے لینے کے جواز کی کوئی صورت نہیں' اس لئے کہ یہ کمیشن بلا عوض ہے جو فقہ میں رشوت کہلاتا ہے' جب وہ شیئرز لے گا تو کمپنی کا شریک بن جائے گا اور شریک بننے پر رقم لینے کا کوئی جواز نہیں۔ تاہم چند باتیں ایسی ہیں جن پر(Under Writer) اجرت لے سکتا ہے۔ مثلاً ضمان الاکتتاب سے پہلے ضمانت دینے والے کو کمپنی کے بارے میں کئی چیزوں کا جائزہ لینا پڑتا ہے' مثلاً کمپنی کیا کاروبار کرے گی' کون لوگ کمپنی کو لے کر چلیں گے' نفع نقصان کے کیا امکانات ہیں؟ اس کو "دراسات"(Studies) کہتے ہیں۔ ضمانت دینے والا ان دراسات کا حقیقی خرچ لے سکتا ہے۔ ایسے ہی اس ضمانت کے انداز کو تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ بنک اس بات کی ضمانت دینے کی بجائے کہ میں حصے خرید لونگا اس بات کا معاہدہ کرے کہ جو شیئرز نہیں خریدے جائیں گے میں ان کے خریدار مہیا کروں گا۔ یہ ایسا عمل ہے جو سمسرہ کے قبیل سے ہے۔ اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ اس تبدیلی میں کوئی خاص عملی مشکل بھی نہیں' اس لئے کہ مروّجہ صورت میں بھی بنک عملاً یہی کرتا ہے کہ شیئرز اپنے پاس نہیں رکھتا' بلکہ دوسرے لوگوں کو بیچ دیتا ہے۔

واضح رہے کہ بعض معاصرین نے ضمان الاکتتاب (Under Writing) پر اجرت لینے کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ضامن الاکتتاب (Under writer) کو اجرت دینے کے بجائے اسکو حصے کم قیمت پر فروخت کر دیئے جائیں' مثلاً دس روپے کا حصہ ساڑھے نو روپے میں دیدیا جائے' لیکن در حقیقت یہ صورت بھی شرعاً جائز نہ ہوگی' کیونکہ حصہ لینے کا مطلب کمپنی کے ساتھ شرکت قائم کرنا ہے' اور اگر دس روپے کا حصہ ساڑھے نو روپے میں دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ضامن ساڑھے نو روپے میں دس روپے کے اثاثوں کا مالک بن جائیگا جو شرکت کے آغاز میں جائز نہیں ہے۔

شیئرز کی شرعی حیثیت اور ان کی خرید و فروخت

بعض علمائے معاصرین (جو بہت کم ہیں) کی رائے یہ ہے کہ یہ شیئر کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی نہیں کرتا ہے، بلکہ یہ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس شخص نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے، جیسے دیگر قرضوں کی دستاویزات ہوتی ہیں، جیسے بانڈز وغیرہ، ایسے ہی یہ بھی ایک شہادۃ اور دستاویز ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ بانڈز وغیرہ پر معین شرح سے سود ہوتا ہے اور شیئرز پر سود کی شرح معین نہیں ہوتی، بلکہ کمپنی کو جو نفع ہوتا ہے، اسی کا ایک متناسب حصہ اس کو دیدیا جاتا ہے، اگر شیئر کمپنی کے اثاثوں میں ملکیت کی نمائندگی کرنے والا ہوتا تو شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں جہاں اس کی دوسری املاک کی قرقی ہوتی ہے، کمپنی میں اس کی متناسب ملکیت کی بھی قرقی ہونی چاہئے، مگر نہیں ہوتی، معلوم ہوا کہ کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت نہیں ہوتی۔

اس نقطۂ نظر کی بناء پر نہ شیئر لینا جائز ہے اور نہ اس کو کم و بیش پر آگے بیچنا اور خریدنا جائز ہے اور چونکہ شیئر ہولڈر کی اثاثوں میں ملکیت نہیں، اس لئے ان کے ہاں زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوگی۔

اس نقطۂ نظر پر کافی غور کیا گیا، لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے، کمپنی کے ظاہری تصور کے اعتبار سے اور اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی روشنی میں واقعتاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیئر ہولڈر کی کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر باہمی قرارداد سے کمپنی تحلیل ہو جائے تو شیئر ہولڈرز کو صرف ان کی لگی ہوئی رقم واپس نہیں ملتی، بلکہ کمپنی کے اثاثوں کا متناسب حصہ ہر شیئر ہولڈر کو دیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسری مالی دستاویزات مثلاً بانڈ وغیرہ پر کمپنی تحلیل ہونے کی صورت میں صرف لگی ہوئی رقم بمعہ سود واپس دی جاتی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ شیئر محض قرضے کی شہادت نہیں، بلکہ یہ شیئرز کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈرز کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

شیئرز کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ شیئرز اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں، بلکہ اس کی پشت پر جو املاک اور اثاثے ہیں وہ اصل چیز ہے، لہٰذا شیئرز کی خرید و فروخت دراصل کمپنی کے اثاثوں میں سے متناسب ملکیت کی خرید و فروخت ہے۔ اور کمپنی کے اثاثے مختلف صورتوں میں ہوتے ہیں۔ نقد، قابلِ وصول دیون، جامد اثاثے، سامان تجارت وغیرہ۔ اور ہر قسم میں شیئر ہولڈرز کا متناسب حصہ ہوتا ہے، لہٰذا شیئر کی فروختگی کا مطلب یہ ہے کہ نقد، دیون، جامد اثاثوں اور اموالِ تجارت میں سے ہر ایک میں اپنی متناسب ملکیت کو فروخت کر رہا ہے۔ شیئر کی خرید و فروخت کی اس حیثیت کے مطابق شیئر کی خرید و فروخت کی شرائط و تفصیلات یہ ہیں۔

شیئرز کی بیع و شراء کی شرائط

(۱)۔۔۔شیئرز کی کم و بیش پر خرید و فروخت کے جواز کی ایک شرط یہ ہے کہ کمپنی کے اثاثے صرف نقد اور دیون کی شکل میں نہ ہوں۔ اگر کمپنی نے ابھی تک کسی قسم کے جامد اثاثے (مثلاً بلڈنگ، مشینری وغیرہ) یا سامان تجارت نہیں خریدے بلکہ اس کے پاس صرف نقود ہیں یا کسی کے ذمے دیون ہیں تو اس صورت میں شیئرز کی بیع و شراء اسکی قیمت اسمیہ (Face Value) سے کم و بیش پر جائز نہیں۔ اس لئے کہ اب شیئر صرف نقد کی نمائندگی کر رہا ہے۔ مثلاً دس روپے کا شیئر صرف دس روپے کی نمائندگی کر رہا ہے، اگر اس کو گیارہ روپے میں فروخت کیا جائے گا تو دس روپے کی بیع گیارہ روپے کے ساتھ ہوئی جو کہ ناجائز ہے۔

جب نقود کے علاوہ کمپنی کے دیگر اثاثے بھی وجود میں آجائیں تو اب اس کے اثاثے مخلوط ہو گئے، اس میں نقود اور غیر نقود دونوں شامل ہیں۔ اب شیئرز کی بیع کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی کے اثاثوں میں ہر ایک کے متناسب حصے کی بیع ہو رہی ہے۔ اس مسئلے کا مدار اب "مدعجوۃ" کے مسئلے پر ہوگا۔ "مدعجوۃ" امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے درمیان ایک اختلافی مسئلے کا عنوان ہے، جس کو "سیف محلی" اور "منطقہ مفضضہ" سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اس مسئلے کا حاصل یہ ہے کہ ایسے مال کو جو مالِ ربوی اور غیر ربوی سے مخلوط ہو خالص مالِ ربوی سے بیچا جائے۔ جیسے تلوار پر سونا لگا ہوا ہو تو تلوار غیر ربوی اور سونا ربوی ہے اس کی بیع دنانیر سے ہو تو اس کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے ہاں مخلوط کی خالص مالِ ربوی سے بیع جائز نہیں، جب تک مخلوط سے مالِ ربوی کو الگ نہ کر لیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ کے ہاں یہ بیع جائز ہے بشرطیکہ خالص مالِ ربوی مخلوط میں شامل مالِ ربوی سے زیادہ ہو۔ مالِ ربوی کے مقابلے میں مالِ ربوی ہوگا اور زائد خالص مالِ ربوی غیر ربوی کے مقابلے میں ہوگا۔ البتہ بعض شافعیہ اور حنابلہ کا موقف یہ ہے کہ اگر مخلوط میں اکثر مالِ ربوی ہو تو خالص مالِ ربوی سے بیع ناجائز ہے، اور اگر مخلوط میں غیر ربوی مال زیادہ اور مالِ ربوی کم ہو تو خالص مالِ ربوی سے بیع جائز ہے۔

بالکل یہی صورت حال یہاں ہے کہ نقود و غیر نقود کی بیع صرف نقود سے ہو رہی ہے، لہٰذا امام شافعیؒ کی رائے کے مطابق ایسی حالت میں شیئرز کی بیع جائز نہیں۔ اور بعض شافعیہ اور حنابلہ کے موقف کے مطابق اگر کمپنی کے اثاثے زیادہ ہیں اور نقود کم ہیں تو شیئرز کی بیع جائز ہوگی۔ اور اگر نقود زیادہ اور دیگر اثاثے کم ہیں تو شیئرز کی بیع ناجائز ہوگی۔

آج کل علمائے عرب میں سے اکثر یہی فتویٰ دے رہے ہیں۔ اس کی رو سے شیئرز خریدنے سے پہلے کمپنی کے اثاثوں کا جائزہ لینا ضروری ہوگا کہ نقود زیادہ ہیں یا غیر نقود زیادہ ہیں ـــــــ لیکن حنفیہ کے ہاں اس تحقیق کی ضرورت نہیں۔ جب یہ تحقیق ہو جائے کہ کمپنی کے کچھ اثاثے غیر نقد بھی ہیں تو اب لکھی ہوئی قیمت (Face Value) سے زیادہ پر بیع و شراء جائز ہوگی۔ البتہ ہر شیئر کے حصے میں کمپنی کے نقود اور دیون کی جتنی مقدار آئی ہے' اگر شیئر کی کل قیمت اس کے برابر یا اس سے کم ہو تو بیع جائز نہ ہوگی۔ مثلاً دس روپے کے حصے میں اگر آٹھ روپے نقود و دیون کے مقابل ہیں' اور دو روپے جامد اثاثوں کے مقابل' تو شیئر کی بیع آٹھ روپے یا اس سے کم میں جائز نہ ہوگی' البتہ نو روپے یا اس سے زائد میں جائز ہوگی۔

(۲) ـــــ شیئرز کی خرید و فروخت کے جواز کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ کمپنی حلال کام کرتی ہو۔ اگر کمپنی کا اصل کاروبار ہی حرام ہو تو اس کے شیئر لینا جائز نہیں۔ مثلاً کوئی کمپنی شراب کا کاروبار کرتی ہو یا کمپنی کا اصل کاروبار ہی سود ہو جیسے بنک وغیرہ۔

(۳) ـــــ بعض اوقات یہ صورت ہوتی ہے کہ کمپنی اصلاً تو حلال کاروبار ہی کرتی ہے مگر کسی نہ کسی طرح سود میں ملوث ہو جاتی ہے۔ مثلاً بنک سے سود پر قرضہ لیتی ہے' یا زائد رقم بنک میں رکھوا کر اس پر سود لیتی ہے۔ یہ کمپنی کا اصل کاروبار نہیں' بلکہ ایک ذیلی اور ضمنی کام ہے۔ آج کل بیشتر کمپنیاں اسی نوعیت کی ہیں۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز لینے کا کیا حکم ہے؟ اس میں علمائے عصر کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سودی کاروبار کمپنی اصلاً کر رہی ہو یا تبعاً' سودی کاروبار کم ہو یا زیادہ۔ ہر صورت میں چونکہ سودی کاروبار کر رہی ہے اور کوئی شخص اگر کمپنی کا شیئر لیتا ہے تو یہ کمپنی کو سودی کاروبار کا وکیل بنا رہا ہے۔ لہٰذا کمپنی کا سودی لین دین اس کی طرف بھی منسوب ہوگا۔ اس لئے جو کمپنی کسی نہ کسی طرح سودی لین دین میں ملوث ہو اس کے شیئرز لینا جائز نہیں۔ خواہ اس کا حقیقی کاروبار درست ہو ـــــــ لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے سودی لین دین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کمپنی قرضہ لے اور اس پر سود ادا کرے۔ اس صورت میں کمپنی کی آمدنی میں تو کوئی حرام عنصر شامل نہیں ہوا' اس لئے کہ جب کوئی شخص سود پر قرضہ لے تو یہ فعل تو حرام اور سخت گناہ ہے' مگر وہ قرض کا مالک بن جائے گا' اس کے ساتھ کاروبار کر کے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ بھی حلال ہوگی۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ کمپنی چونکہ اس شیئر ہولڈر کی وکیل ہے' اس لئے سودی قرضے لینے کی نسبت اس کی طرف بھی ہوگی اور اس کو سودی قرضے لینے پر رضامند سمجھا جائے گا۔ اس کا جواب حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ شیئر ہولڈر کسی طرح یہ آواز اٹھا دے کہ

میں سودی کاروبار پر راضی نہیں ہوں تو اس کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔ کمپنی کے ذمے داران کی طرف اس مضمون کا خط لکھ دینا بھی کافی ہو سکتا ہے [1] (آج کل اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ سالانہ جمعیت (A.G.M) میں اس کی آواز اٹھائی جائے۔) اس پر بھی اشکال ہو سکتا ہے جو حضرت ﷺ نے ذکر نہیں فرمایا۔ وہ یہ کہ کمپنی کے ذمہ داران شرکت کی وجہ سے اس کے وکیل تو بہرحال ہیں اور یہ معلوم ہے کہ جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اس پر عمل نہیں ہو گا تو وکالت کے ہوتے ہوئے ایسی غیر موثر آواز اٹھانے سے وہ بری الذمہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کمپنی میں جو وکالت ہے یہ اس وکالت سے مختلف ہے جو شرکت (Partner Ship) میں ہوتی ہے۔ شرکت میں ہر شریک کی وکالت اس درجے قوی ہوتی ہے کہ ایک شریک بھی اگر کسی کاروبار سے اختلاف کر دے تو وہ کاروبار نہیں کیا جا سکتا۔ شرکت میں فیصلے اتفاق رائے سے ہوتے ہیں۔ جب کہ کمپنی میں وکیل اور موکل کا رشتہ اس درجہ قوی نہیں ہوتا کہ ایک شیئر ہولڈر بھی اختلاف کر دے تو فیصلہ نہ ہو پائے۔ کمپنی میں فیصلے اتفاق رائے سے نہیں ہوتے ہیں اور نہ اتفاق رائے سے کام چلانا ممکن ہے' یہاں فیصلے کثرت رائے سے ہوتے ہیں۔ اب جہاں فیصلے کثرت رائے سے ہوتے ہوں وہاں کوئی شخص سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھائے مگر اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو اور سودی لین دین بدستور جاری رہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سودی لین دین اس کے خلاف آواز اٹھانے والے کی وکالت اور رضامندی سے ہو رہا ہے ---------- لہٰذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کمپنی کا اصل کاروبار تو جائز ہو اور ضمناً کبھی وہ سود پر قرضہ لیتی ہو تو اس کے شیئرز لینا جائز ہے' بشرطیکہ سود سے براءت کی آواز اٹھا دی جائے۔

کمپنی کے سودی لین دین کی دوسری صورت یہ ہے کہ کمپنی قرضہ دے کر سود لے' جیسا کہ آج کل بیشتر کمپنیاں زائد رقم بنکوں کے سیونگ اکاؤنٹ میں رکھوا کر اس پر سود لیتی ہیں۔ یہاں دو اشکال ہیں۔ ایک یہ کہ سودی معاملے میں شیئر ہولڈر کی بھی شرکت ہو جائے گی۔ اس کا حل تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ کمپنی جو منافع (Dividend) تقسیم کرے گی اس میں سود بھی شامل ہو گا۔ آمدنی کا جو حصہ سود سے حاصل ہوا وہ حرام ہے۔ اس کے بارے میں حضرت تھانوی ﷺ نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ ہمیں ہر کمپنی کے بارے میں یقین سے معلوم نہیں کہ اس نے سود لیا ہے' تعمق کے ہم مامور نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر بالفرض سود لیا بھی ہو تو وہ قلیل ہے جو مال

---

[1] امداد الفتاوی ج ۳ ص ۴۹۱

حلال میں مخلوط ہو گیا ہے۔مال مخلوط میں اکثر حلال ہو تو اس کے استعمال کی گنجائش ہوتی ہے ــــــــــ لیکن اس پر ایک اشکال رہتا ہے کہ کوئی شخص مال مخلوط میں سے ہدیہ دے اور حرام حصہ اس مال مخلوط میں کم ہو تو ہدیہ لینا اس لئے جائز ہے کہ یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حلال میں سے دے رہا ہے' لیکن کمپنی کے نفع (Dividend) کی صورت اس سے مختلف ہے' اس لئے کہ کمپنی کو جتنی مدات سے آمدنی حاصل ہوئی ہر مد کی آمدنی کا ایک متناسب حصہ اس نفع (Dividend) میں شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا سود کا ایک متناسب حصہ بھی نفع (Dividend) میں شامل ہے۔اگر کمپنی کی آمدنی کا دس فیصد حصہ سودی اکاؤنٹ سے حاصل ہوا ہے تو نفع (Dividend) کا بھی دس فیصد حصہ سودی ہو گا۔ لہٰذا نفع (Dividend) کا جتنا حصہ سودی ہے اس کا بلا نیت ثواب صدقہ کرنا لازمی ہو گا۔یہ بات کہ آمدنی کا کتنا حصہ سودی ہے' کمپنی کے (Income Statements) سے معلوم کی جا سکتی ہے۔اگر اس میں اسکی وضاحت نہ ہو تو کمپنی کے ذمے داران سے معلوم بھی کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ :ــــــ یہ کہ کسی کمپنی کے شیئرز کی خرید و فروخت کی چار شرائط ہوئیں۔

(۱)ــــ کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہو۔

(۲)ــــ قیمتِ اسمیہ (Face Value) سے کم و بیش پر بیچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کمپنی کے اثاثے صرف نقد کی شکل میں نہ ہوں۔

(۳)ــــ سود کے خلاف آواز اٹھائے۔

(۴)ــــ کمپنی کی آمدنی میں سود شامل ہو تو نفع کی اتنی مقدار صدقہ کر دے۔

شیئرز سے تجارت (Capital Gain) کا حکم

شیئرز کی خرید و فروخت پر جو گفتگو اب تک کی گئی ہے یہ اس صورت میں ہے جب کہ شیئرز خریدنے والے کا مقصد کمپنی کا حصہ دار بن کر سرمایہ کاری کرنا ہی ہو۔اگر خریدار کا مقصد سرمایہ کاری نہ ہو' بلکہ اس ارادے سے خریدے کہ اس کی قیمت بڑھے گی تو فروخت کر کے نفع کماؤں گا۔اس طریقے سے شیئرز کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟ اس میں بھی دو نقطۂ نظر ہیں۔فقہ خصوصاً فقہ المعاملات میں مہارت رکھنے والے عالم اسلام کے معروف عالم شیخ محمد صدیق الضریر کی رائے یہ ہے کہ اس طریق کار کی بنیاد محض تخمین اور قیاس آرائیوں پر ہے جس کو (Speculation) کہتے ہیں' اس لئے یہ جائز نہیں۔ان کا کہنا یہ ہے کہ قیاس آرائیوں کی بنیاد پر خرید و فروخت کی اجازت دینا سٹہ بازی کا راستہ کھولنا ہے۔ان کے ہاں شیئرز خریدنا صرف اس صورت میں جائز ہو گا' جب کہ خریدار کمپنی کے نفع' نقصان میں شریک ہو کر سرمایہ کاری کے لئے خرید رہا ہو۔

اصولی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصل سوال یہ نہیں کہ خریدار کس ارادے اور نیت سے خرید رہا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ شیئرز فی نفسہ بیع و شراء کے قابل ہیں یا نہیں؟ جب یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ شیئرز قابل بیع و شراء ہیں۔ شیئرز کی بیع دراصل کمپنی کے اثاثوں میں متناسب حصے کی بیع ہے تو خرید و فروخت جائز ہوگی خواہ کسی بھی نیت سے ہو۔ خواہ شیئرز اپنے پاس رکھ کر سرمایہ کاری کے لئے ہو یا قیمت بڑھنے پر بیچ کر نفع کمانے کے لئے ہو۔ کسی چیز کو قابل بیع و شراء ماننے کے بعد محض نیت کی بنیاد پر جواز و عدم جواز کی تفریق کی کوئی فقہی وجہ نہیں۔ ہاں! البتہ بیع و شراء کی شرعی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور ان شرائط کی رعایت کرنے سے سٹہ بازی کا سدّ باب خود ہی ہو جائے گا۔

یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ تخمین و قیاس آرائی جس کو (Speculation) کہا جاتا ہے 'بذات خود حرام ہے' یہ بات غلط ہے۔ تخمین (Speculation) یہ ہے کہ یہ اندازہ لگایا جائے کہ کس چیز کی قیمت بڑھ رہی ہے اور کس کی قیمت کم ہو رہی ہے۔ جس کی قیمت کم ہونے کا اندیشہ ہو اس کو بیچ دیا جائے اور جس کی قیمت بڑھنے کی امید ہو اس کو رکھا جائے۔ یہ بات بذات خود ممنوع نہیں 'یہ تو ہر تجارت میں ہوتی ہے۔ جو بات ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ بیع و شراء کی شرعی شرائط کی رعایت نہ کی گئی ہو' مثلاً غیر مملوک کی بیع یا غیر مقبوض کی بیع کی جارہی ہو یا قمار کی شکل بن رہی ہو۔ قمار دو باتوں سے مل کر بنتا ہے۔ ایک یہ کہ ایک طرف سے ادائگی متعین ہو اور دوسری طرف سے موہوم ہو۔ دوسری بات یہ کہ جس طرف سے ادائگی ہوگئی ہے اس کی رقم دو باتوں میں دائر ہو یا تو یہ رقم خود بھی ڈوب جائے گی یا اور رقم کو کھینچ کر لائے گی۔

اس تفصیل کی روشنی میں شیئرز کی بیع و شراء کی جزئیات پر غور کیا جائے تو درج ذیل مسائل سامنے آتے ہیں۔

(۱) --- پہلے بتایا جاچکا ہے کہ بعض کمپنیوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اسٹاک ایکسچینج میں ان کی لسٹنگ ہو جاتی ہے۔ ایسی (Provisionally Listed) کمپنی کے شیئرز کی بیع و شراء جائز نہیں 'اس لئے کہ شیئرز کی بیع دراصل کمپنی کے اثاثوں کی بیع ہوتی ہے اور یہاں ابھی کمپنی کی ملکیت میں اثاثے ہیں ہی نہیں۔ لہٰذا یہ غیر مملوک کی بیع ہے جو جائز نہیں ہے' عملاً ایسے شیئرز کی بیع و شراء اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ ایک کمپنی کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کا دس روپے کا شیئر ۱۸۰ روپے تک میں فروخت ہوا۔

(۲)---(Future Sales) یعنی شیئرز کی ایسی بیع و شراء کہ شیئر لینا دینا مقصود نہ ہو، محض نفع، نقصان برابر کر کے نفع کمانا مقصود ہو تو یہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

(۳)--- غائب سودے جن میں بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے وہ بھی شرعاً جائز نہیں۔ اس لئے کہ بیع کی وقت مستقبل کی طرف اضافت یا تعلیق باتفاق فقہاء ناجائز ہے۔ البتہ مستقبل میں بیع کا وعدہ کیا جا سکتا ہے، لیکن وقت آنے پر بیع باقاعدہ کرنی ہوگی۔

(۴)--- حاضر سودے جائز ہیں۔ خواہ نیت سرمایہ کاری کی ہو، چاہے شیئرز بیچ کر نفع کمانے کی ہو۔

(۵)--- حاضر سودے میں بھی شیئرز کا قبضہ بعض انتظامی مجبوریوں کی بناء پر ایک سے تین ہفتوں تک تاخیر سے ہوتا ہے، حاضر سودا ہو جانے کے بعد شیئرز وصول کرنے سے پہلے ان کی آگے بیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا دارومدار اس پر ہے کہ یہ معلوم ہو کہ یہ بیع قبل القبض ہے یا نہیں؟ اگر بیع قبل القبض ہے تو جائز نہیں، ورنہ جائز ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ یہ بیع قبل القبض ہے یا نہیں پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ شیئر کا قبضہ کس چیز کو کہیں گے؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے "شیئر" درحقیقت کمپنی کی املاک میں متناسب حصہ داری کا نام ہے، اور "شیئر سرٹیفکیٹ" درحقیقت اس حصہ داری کا تحریری ثبوت ہے، لہذا مبیع وہ تحریری ثبوت نہیں، بلکہ کمپنی کی املاک کا ایک مشاع حصہ ہے، یہ مشاع حصہ بیع کی تکمیل ہوتے ہی مشتری کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، چونکہ وہ حصہ مشاع ہے، اس لئے اس پر حسی قبضہ تو ہو نہیں سکتا، لہذا اس میں معنوی قبضہ ہی معتبر ہونا چاہئے۔ اب دو صورتیں ہیں، یا تو یوں کہا جائے کہ معنوی قبضہ اس وقت ہوگا جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، یا پھر یوں کہا جائے کہ جس وقت وہ مشاع حصہ مشتری کے ضمان میں آجائے اس وقت معنوی قبضہ متصور ہوگا۔ اس بات کو طے کرنے کے لئے بیع قبل القبض کی حقیقت معلوم کرنا ضروری ہے۔ بیع قبل القبض کی ممانعت کا مدار دو وجہوں پر ہے۔ (۱) قبضے سے پہلے مبیع مقدور التسلیم نہیں ہوتا، لہذا یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہ مشتری کو ضرور قبضہ کرا دے گا، یہ غرر ہے جس کی بناء پر بیع جائز نہیں۔ بیع کی بہت سی صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان میں یہ غرر کی وجہ نہیں پائی جاتی۔ باوجود اس کے کہ مبیع حساً مقبوض نہیں لیکن حکماً وہ مشتری کے تصرف میں آجاتی ہے۔ لہذا ایسی صورتوں میں بیع قبل القبض نہیں پائی جائیگی۔ (۲) بیع قبل القبض کی ممانعت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قبضے سے پہلے مبیع بائع کے ضمان میں نہیں آتا اور ربح مالم یضمن جائز نہیں۔

اب جہاں حسی قبضہ تو نہ ہوا ہو، مگر مشتری کا حکماً قبضہ ہو چکا ہو، یعنی مبیع سے انتفاع بھی مشتری کے تصرف میں آچکا ہو، اور اس کا ضمان بھی ثابت ہو چکا ہو تو اس کی بیع

جائز ہوگی۔ اسٹاک ایکسچینج کے لوگوں سے تفصیلی گفتگو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ حاضر سودا ہو جانے کے بعد شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حاضر سودا ہو جانے کے بعد شیئرز پر حسی قبضے سے پہلے اگر کسی حادثے کے نتیجے میں کمپنی بالکل نیست و نابود ہو جائے تو نقصان مشتری کا سمجھا جاتا ہے' اسٹاک ایکسچینج بائع کو پیسے دلوائے گا۔ ایسے ہی قبضے سے پہلے نفع (Dividend) تقسیم ہو جائے تو گو کمپنی تو بائع کے نام نفع جاری کرے گی' اس لئے کہ کمپنی کے ریکارڈ میں ابھی تک بائع کا نام ہی درج ہے' لیکن کاروباری ضابطے کی رو سے وہ اس بات کا پابند ہوگا کہ شیئرز کے ساتھ نفع بھی مشتری کو دے۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ حسی قبضے سے پہلے بھی وہ شیئرز مشتری کے ضمان میں آچکے ہیں۔ اب جو بات باقی ہے وہ صرف یہ کہ شیئرز کی ملکیت کا تحریری ثبوت مشتری کے پاس آجائے۔ اور محض اتنی بات سے قبضہ منتفی نہیں ہوتا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ کے ہاتھ میں آنے سے پہلے بھی شیئرز کی بیع جائز ہو۔ لیکن دوسری طرف اگر اس جانب نظر کی جائے کہ ہر چیز کے قبضہ کا طریقہ عرف سے متعین ہوتا ہے' اور عرف میں شیئر کا قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے' تو پھر عدم جواز کا حکم ہونا چاہئے بالخصوص جب کہ اس طرح سٹے کے کاروبار کی حوصلہ افزائی بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ان متعارض جہات کی موجودگی میں احتیاط اسی میں ہے کہ سرٹیفکیٹ پر قبضہ کئے بغیر آگے بیع نہ کی جائے۔

شیئرز پر زکوٰۃ

کمپنی کے شیئرز پر زکوٰۃ کے کیا احکام ہیں؟ اس سلسلے میں تین باتیں قابل ذکر ہیں۔

(۱)۔۔۔ کمپنی پر بحیثیت کمپنی (جو شخص قانونی ہے) زکوٰۃ واجب نہیں۔ اس کا مدار خلطۃ الشیوع کے مسئلے پر ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے ہاں خلطۃ الشیوع کا اعتبار ہے اور زکوٰۃ مجموعہ پر واجب ہوتی ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ بھی تصریح ہے کہ خلطۃ الشیوع کا اعتبار صرف سوائم ہی میں نہیں' اموال تجارت میں بھی ہوتا ہے' اس لئے ان کے ہاں کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگرچہ کمپنی ایسا شخص نہیں جو مکلف ہو اور زکوٰۃ ایک عبادت ہے جو مکلف پر واجب ہوتی ہے' لیکن شافعیہ کا اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ انسان پر نہیں' بلکہ اموال پر واجب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں نابالغ کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے' حالانکہ وہ مکلف نہیں' لہٰذا ان کے ہاں کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہے' مگر شیئر ہولڈرز پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ اس لئے کہ حدیث میں یہ اصول مذکور ہے۔

"لاثنی فی الاسلام"

یعنی ایک مال پر دوہری زکواۃ نہیں ہوتی ـــــــ حنفیہ کے ہاں خلطۃ الشیوع کا اعتبار نہیں اور ان کے ہاں زکواۃ انسان پر واجب ہوتی ہے' اس لئے حنفیہ کے ہاں کمپنی پر بہ حیثیت شخص قانونی زکواۃ نہیں' شیئرہولڈرز پر زکواۃ واجب ہوگی۔

(۲)ـــ شیئرز پر زکواۃ کس حساب سے دی جائے گی؟ اس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ شیئرز کی قیمتیں تین طرح کی ہیں۔ (۱)۔فیس ویلیو۔یعنی سرٹیفکیٹ پر لکھی ہوئی قیمت (۲)۔مارکیٹ ویلیو۔یعنی بازاری قیمت جس پر شیئرز بازار میں فروخت ہوتے ہیں۔ (۳)۔بریک اپ ویلیو۔(Break Up Value) یعنی اگر کمپنی تحلیل ہو تو ہر شیئر کے مقابلے میں کمپنی کے اثاثوں کا جو حصہ آئے گا وہ بریک اپ ویلیو ہے۔ان تین طرح کی قیمتوں میں سے کس حساب سے زکواۃ واجب ہوگی؟ اگر کسی کمپنی کی بریک اپ ویلیو بہ آسانی معلوم ہو سکتی ہو تو غالباً زکواۃ کے حساب کی بنیاد بننے کے لئے وہ سب سے زیادہ موزون ہے' لیکن بریک اپ ویلیو کا تعین بہت مشکل ہے' اور عام حصہ داروں کیلئے تو بہت ہی مشکل ہے' لہٰذا اس بات پر تقریباً تمام علماء عصر کا اتفاق ہے کہ بازاری قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اس لئے کہ قیمت اسمیہ اگرچہ ابتداءً سرمایہ لگاتے وقت تو حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے' مگر جب سرمایہ کمپنی کے اثاثوں میں بدل جائے گا تو اب فیس ویلیو حقیقت کے زیادہ قریب نہیں' اس لئے کہ اثاثوں کی قیمت کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔مارکیٹ ویلیو میں اثاثوں کے علاوہ دوسرے عوامل اثرانداز ہوں تب بھی مارکیٹ ویلیو حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔

دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ شیئر کمپنی کے تمام اثاثوں میں متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔اور کمپنی کے بعض اثاثے قابل زکواۃ ہوتے ہیں' جیسے نقود' اموال تجارت وغیرہ۔اور بعض قابل زکواۃ نہیں ہوتے' جیسے بلڈنگ' مشینری وغیرہ۔ شیئرز کی زکواۃ ادا کرتے ہوئے قابل زکواۃ یا ناقابل زکواۃ میں تفریق کی جائے گی یا نہیں؟ اس میں فقہائے عصر کی دو رائیں ہیں۔مصر کے شیخ ابو زھرۃ مرحوم کی رائے یہ ہے کہ شیئرز خود عروض تجارت بن چکے ہیں' اس لئے ان کی پوری مارکیٹ ویلیو پر زکواۃ ہوگی۔اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے پیچھے کتنے اثاثے قابل زکواۃ ہیں اور کتنے ناقابل زکواۃ ہیں؟ دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ شیئرز چونکہ کمپنی کے اثاثوں میں ہی ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں' اس لئے اثاثوں کے قابل زکواۃ یا ناقابل زکواۃ ہونے کی تحقیق کی جا سکتی ہے' میں نے ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ اگر کسی نے کمپنی کے منافع میں شرکت کے لئے شیئر لیا ہے تو اس کو عروض تجارت میں شمار کرنا مشکل ہے اس میں گنجائش ہے کہ اگر کسی کے لئے قابل زکواۃ اور ناقابل زکواۃ اثاثوں کی تحقیق ممکن ہو تو وہ تحقیق کر کے صرف قابل زکواۃ اثاثوں کی حد تک زکواۃ دے اور جو شخص یہ تحقیق نہ کر سکتا

ہو وہ احتیاطاً پوری بازاری قیمت کی زکواۃ دیدے۔ اور اگر کسی نے شیئر تجارت کرنے کے لئے اور آگے بیچ کر نفع کمانے کے لئے خریدا ہے (Capital Gain) تو یہ عروض تجارت میں شمار ہوگا، اس لئے کہ گویا اس نے کمپنی کے اثاثوں کا ایک متناسب حصہ آگے بیچنے کے لئے خرید لیا ہے اس لئے تمام قیمت پر زکواۃ واجب ہوگی۔

(۳)۔۔۔ فقہی اصول یہ ہے کہ کسی پر دیون واجب ہوں تو دیون منہا کر کے باقی اموال پر زکواۃ واجب ہوتی ہے۔ مگر یہ بات آج کل بہت قابل غور ہے کہ اکثر بڑے بڑے سرمایہ داروں نے بنکوں اور دیگر مالیاتی اداروں سے اتنے قرض لے رکھے ہوتے ہیں کہ ان کے قرضے انکے قابل زکواۃ سرمائے سے عموماً بڑھ جاتے ہیں۔ عموماً صورتحال یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے قرضے منہا کئے جائیں تو نہ صرف یہ کہ ان پر زکواۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ بعض صورتوں میں وہ خود مستحق زکواۃ قرار پائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک تجویز تو یہ پیش کی جاتی ہے کہ مشینری پر زکواۃ واجب قرار دی جائے، لیکن یہ بات اس لئے قابل تسلیم نہیں کہ مشینری کو مال زکواۃ قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ بات منصوص ہے۔ اس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ زکواۃ سے دیون کا مستثنیٰ ہونا فقہاء کے ہاں متفق علیہ نہیں۔ حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں تو دیون مستثنیٰ ہوتے ہیں، شافعیہ کے ہاں مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ اور مالکیہ کے ہاں نقود میں تو مستثنیٰ ہوتے ہیں غیر نقود میں نہیں ہوتے[۱]۔ احقر کی ناچیز رائے اس مسئلے کے بارے میں یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جو قرضہ لیا گیا ہے وہ کہاں صرف کیا گیا۔ اگر ان قرضوں کے ذریعے ایسی اشیاء خریدی گئیں جو خود قابل زکواۃ ہیں تو یہ قرضے زکواۃ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اور اگر ان قرضوں سے ایسی اشیاء خریدی گئیں جو قابل زکواۃ نہیں تو یہ قرضے مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ ان قرضوں کے سلسلے میں مالکیہ اور شافعیہ کے قول پر عمل کیا جائے گا۔ یہ رائے قائم کرنے کے بعد حافظ ماردینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الجوہر النقی" میں نظر سے گذرا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی اس کے قریب ہے۔ وہ فرماتے ہیں، ان کان عندہ عروض، ففی بدینہ علیہ زکاۃ العین (الجوہر النقی حاشیہ بیہقی ص ۱۴۹ ج ۴ باب الدین مع الصدقۃ)۔

---

[۱] کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ للجزیری ۱: ۶۰۲-۶۰۵ بحث زکاۃ الدین، وفقہ الاسلام وادلتہ ۲: ۷۴۷

نظام زر

(Monetary System)

زر، نقد (Money) کی تعریف

جو چیز عرفاً آلۂ مبادلہ کے طور پر استعمال ہوتی ہو اور وہ قدر کا پیمانہ ہو اور اس کے ذریعے مالیت کو محفوظ کیا جاتا ہو، اسے "زر" کہتے ہیں۔ یہ تین خصوصیات جس چیز میں پائی جاتی ہوں اس کو معاشی اصطلاح میں عربی میں "نقد" اردو میں "زر" اور انگریزی میں (Money) کہتے ہیں۔ مالیت کے تحفظ سے مراد یہ ہے کہ کسی کے پاس جنس رکھی ہوئی ہو تو اس کی قیمت کم و بیش ہوتی رہتی ہے، نیز ضروری نہیں کہ ہروقت اس کا کوئی خریدار مل جائے۔ اس لئے اس کی مالیت مکمل طور پر محفوظ نہیں۔ اس کے بجائے اگر زر رکھ لیا جائے تو عام حالات میں اس سے مالیت محفوظ رہتی ہے، یعنی غیر معمولی حالات سے قطع نظر، اس کی ذاتی قیمت یکساں رہتی ہے، نیز اس سے کوئی بھی چیز جب چاہیں خریدی جا سکتی ہے۔

زر اور کرنسی میں فرق

زر وہ چیز ہے جسکے ذریعے سے تبادلہ ہوتا ہو، قدر کی پیمائش ہوتی ہو اور مالیت کا تحفظ بھی ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ قانونی طور پر بھی اسکو جبری آلۂ تبادلہ قرار دیا گیا ہو۔ مثلاً چیک یا انعامی بانڈز جیسی دستاویزات سے لوگ تبادلہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص انعامی بانڈ سے ادائیگی کرے اور دوسرا شخص اپنا حق انعامی بانڈ کی صورت میں لینے پر آمادہ نہ ہو تو اسکو قانوناً لینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور کرنسی وہ زر ہے جسکو خاص ملک میں قانونی طور پر آلۂ تبادلہ قرار دیا گیا ہو جیسے روپیہ۔ اگر کوئی شخص روپے میں ادائیگی کرے تو قانوناً اسے لینے پر مجبور کیا جائیگا۔ ایسی قانونی کرنسی کو عربی میں "عملة قانونية" اردو میں "زر قانونی" اور انگریزی میں (Legal Tender) کہتے ہیں۔ پھر اسکی دو قسمیں ہیں۔ ایک ایسی کرنسی جس میں ایک خاص حد تک قانوناً ادائیگی کی جا سکتی ہے، اس سے زائد مقدار دی جائیگی تو قانوناً اسے لینے پر جبر نہیں کیا جائیگا۔ جیسے چونی کہ اگر کوئی شخص چونیوں سے کوئی بڑا قرض ادا کرنا چاہے تو لینے والا قانوناً اسے لینے سے انکار کر سکتا ہے، اور یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ میرا قرض مجھے روپیہ میں ادا کرو۔ اسکو عربی میں "عملة قانونية

محدودۃ" اردو میں "محدود زر قانونی" اور انگریزی میں (Limited Legal Tender) کہتے ہیں۔ دوسری قسم جس میں قانوناً ادائیگی کی کوئی حد مقرر نہ ہو۔ اسکو "عملہ قانونیۃ غیر محدودۃ" یا غیر محدود زر قانونی (Unlimited Legal Tender) کہتے ہیں۔ جیسے دھات یا کاغذ کا روپیہ۔

زر کا ارتقاء اور مختلف نظامہائے زر

ابتداءً لوگوں میں سامان کے بدلے سامان کی بیع کا طریقہ رائج تھا، جس کو "مقایضۃ" (Barter) کہتے ہیں [1] مگر اس میں متعدد دشواریاں تھیں مثلاً یہ کہ سامان کا نقل وحمل مشکل تھا، اس طریقے میں طلب و رسد کا ایک ہی جگہ ملاپ کم ہوتا تھا۔ مثلاً ایک شخص گندم دے کر کپڑے کا خواہشمند ہے اور کپڑے والا گندم لینا نہیں چاہتا۔ اجناس کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کر کے انکو کاروبار کی بنیاد بنانا مشکل تھا۔ "مقایضۃ" (Barter) کے بعد بعض اہم اشیاء کو ہی ثمن قرار دیدیا گیا، مثلاً گندم، جو، چمڑا وغیرہ۔ اس کے بعد سونے اور چاندی کو ثمن قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ عالمی طور پر قابل قبول تھے اور ان کا نقل و حمل بھی آسان تھا۔ ابتداءً سونے کے ذریعے مبادلات سکہ ڈھالے بغیر ان کے وزن کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ اس کے بعد سکے ڈھالنے کا آغاز ہوا۔ شروع میں ہر شخص کو سکے ڈھالنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اس دور کے نظام کو "طلائی معیار" اور عربی میں "قاعدۃ الذھب" اور انگریزی میں (Gold Standard) کہتے ہیں۔ پھر سونے کے علاوہ چاندی کے سکے بھی ڈھالے جانے شروع ہوئے اس نظام زر کو جس میں سونے اور چاندی دونوں کے سکے ڈھالے جاتے تھے "دو دھاتی معیار" (Bi-Metallic Standard) کہتے ہیں۔ اور عربی میں "نظام المعدنین" کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آیا کہ لوگ سونے، چاندی کے سکے صرّافوں کے پاس امانت رکھوا دیتے تھے اور صرّاف اس کے وثیقے کے طور پر رسید لکھ دیتے تھے، بوقت ضرورت رسید دکھا کر صرّاف سے اپنا سونا واپس لیا جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ لوگوں نے صرّافوں کی دی ہوئی رسیدوں سے اشیاء خریدنی شروع کر دیں، یعنی بجائے اس کے کہ خریدار پہلے صرّاف سے سونا لیکر بائع کو دے، اور بائع سونا لیکر پھر صرّاف کے پاس رکھوائے، خریدار بائع کو سونے کی رسید دیدیتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس رسید کا سونا بائع کی طرف منتقل ہو گیا ہے، اس

---

[1] کتابوں میں یہی لکھا گیا ہے، لیکن تاریخ اس بات کی توثیق نہیں کرتی، اس لئے کہ تاریخی طور پر ایسا کوئی دور نہیں ملتا جس میں کوئی چیز بطور زر اور ثمن کے رائج نہ ہو۔

طرح رسیدوں سے لین دین شروع ہوگیا' اور صرافوں سے سونا واپس لینے کی نوبت کم آنے لگی۔ جب صرافوں نے دیکھا کہ لوگ عموماً سونا واپس لینے نہیں آتے تو انہوں نے لوگوں کا رکھا ہوا سونا دوسروں کو قرض دینا شروع کر دیا۔ اس طرح نوٹ اور بینکنگ کا آغاز ہوا یعنی صرافوں کی جاری کی ہوئی رسیدیں نوٹ بن گئیں جس کی تفصیل بینکنگ پر گفتگو کرتے ہوئے ذکر کی جائے گی۔ ابتداءً ہر شخص نوٹ جاری کر سکتا تھا مگر اس وقت یہ زر قانونی(Legal Tender) نہیں تھے۔ صرف لوگوں کے تعامل کی وجہ سے قابل قبول تھے۔ اس مقبولیت اور سہولت کے پیش نظر بعد میں نوٹ کو زر قانونی (Legal Tender) قرار دیا گیا۔ لیکن زر قانونی کی حیثیت رکھنے والے نوٹ ہر شخص کو جاری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ حکومت کے منظور شدہ(Authorised) ادارے (بینک) ہی جاری کر سکتے تھے۔ شروع میں عام تجارتی بینک بھی نوٹ جاری کرتے تھے' بعد میں یہ اختیار صرف مرکزی بینک کی حد تک محدود کر دیا گیا۔

نوٹ کے (Legel Tender) بننے کے بعد اس پر کئی دور گزرے ہیں۔ ایک دور وہ تھا جب نوٹ کے پیچھے سو فیصد سونا ہوتا تھا۔ قانوناً اس بات کی پابندی تھی کہ جتنا سونا موجود ہے' اتنے ہی نوٹ جاری کئے جائیں۔ اس نظام کو عربی میں "قاعدۃ مبادلۃ الذھب" اور انگریزی میں(Gold Bullion Standard) کہتے ہیں۔ پھر جب دیکھا گیا کہ لوگ سونا لینے کم ہی آتے ہیں تو نوٹ کی پشت پر سونے کی شرح کم کر دی گئی۔ شرح کے تناسب بدلتے رہے یعنی نوٹ کی پشت پر رکھے ہوئے سونے کی فیصد شرح گھٹتی چلی گئی۔ ایسے نوٹ کو جس کی پشت پر سو فیصد سونا نہ ہو "نقود الثقة"(Fiduciary Money) کہتے ہیں۔ پھر سونے کی شرح کم ہوتے ہوتے صفر رہ گئی اور کم از کم ملکی معاملات کی حد تک نوٹ کی پشت پر سونے کا وجود ضروری نہیں رہا۔ ایسے نوٹوں کو "النقود الرمزیة" (Token Money) کہتے ہیں۔ ان سکوں کی قانونی قیمت حقیقی قیمت کی نمائندگی نہیں کرتی۔ مثلاً سو روپے کے نوٹ کی قانونی قیمت سو روپے ہے مگر اس کی ذاتی قیمت کچھ بھی نہیں۔ کچھ عرصے تک "نقود رمزیہ" کا بھرم اس طرح رہا کہ بیشتر ممالک نے اپنے نوٹوں کو ڈالر سے وابستہ کر رکھا تھا' گویا ان کے نوٹوں کے پیچھے ڈالر تھے' اور چونکہ امریکہ نے ڈالر کے بدلے سونا دینے کا اقرار کیا ہوا تھا' اس لئے ڈالر کے پیچھے سونا تھا' اور اس طرح دوسرے ملکوں کے نوٹ بھی بالواسطہ سونے سے وابستہ تھے۔ لیکن بالآخر ۱۹۷۱ء میں امریکہ نے بھی سونے سے ڈالر کی وابستگی ختم کر دی' جس کی تفصیل آرہی ہے اور اس طرح اب کسی نوٹ کے پیچھے کوئی سونا چاندی نہیں ہے۔ اب "نوٹ" محض ایک اصطلاحی ثمن ہے جو قوت خرید کی نمائندگی کرتا ہے اور بس۔

شرح مبادلہ کا تعین[98]

مختلف ملکوں کی کرنسیوں کے باہمی تبادلے کی شرح کیسے متعین ہوتی ہے؟ اس کے بھی مختلف زمانوں میں مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۳ء تک دنیا میں طلائی نظام رائج تھا گو اس سے پہلے بھی طلائی نظام رائج تھا مگر جس طرح اس دور انیئے میں مکمل طور پر رائج رہا ویسے پہلے رائج نہ تھا۔

طلائی نظام میں ہر ملک کی کرنسی سونے کی ایک مخصوص مقدار کی نمائندگی کرتی تھی۔ مثلاً انگلینڈ نے طے کر رکھا تھا کہ ایک پونڈ کے پیچھے سونے کی اتنی مقدار ہوگی اور امریکہ نے بھی طے کر رکھا تھا کہ امریکی ڈالر کے پیچھے سونے کی اتنی مقدار ہوگی۔ جب یہ طلائی نظام رائج تھا اس وقت دو ملکوں کی کرنسیوں میں تبادلے کی شرح ان کرنسیوں کی پشت پر موجود سونے کی مقدار کے تناسب سے طے ہوتی تھی۔ یعنی یہ دیکھا جاتا تھا کہ ہر ملک کی کرنسی کے پیچھے سونے کی کتنی مقدار ہے۔ دو ملکوں کی کرنسیوں کے بدلے میں ملنے والی سونے کی مقداروں میں جو تناسب ہوتا اسی تناسب سے کرنسیوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ مثلاً اگر انگلینڈ کے پونڈ کے پیچھے چار تولے سونا ہو اور امریکی ڈالر کے پیچھے دو تولے سونا ہو تو پونڈ اور ڈالر میں ایک اور دو کی نسبت ہوئی 'لہٰذا ایک پونڈ کا دو ڈالر سے تبادلہ ہوگا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ طلائی نظام ختم ہوگیا۔ اس کے بعد شرح مبادلہ کے تعین کا کیا طریقہ رائج ہوا؟ اسکو سمجھنے کے لئے بین الاقوامی تجارتی نظام میں جو تبدیلیاں آئیں ان کی اجمالی وضاحت ضروری ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کا اقتصادی نظام درہم برہم ہوا۔ پھر ۱۹۳۰ء میں عالمی کساد بازاری ہوئی اور تمام ممالک نے نوٹ پر سونا دینا بند کردیا۔ پھر دوسری جنگ کے بعد انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ممالک اقتصادی طور پر درہم برہم ہوگئے' مگر امریکہ اقتصادی طور پر خاصا مستحکم تھا۔ اس کے پاس سونے کے کافی ذخائر تھے۔ ۱۹۴۴ء میں امریکہ کے تعاون سے یورپ کی تعمیر نو کے لئے متعدد ممالک کی ایک عظیم کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس امریکہ کے ایک شہر "بریٹن ووڈز" (Bretton Woods) میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا موضوع یہ تھا کہ عالمی تجارت کو کیسے فروغ دیا جائے؟ سرمایہ کاری (investment) کو کیسے فروغ دیا جائے؟ اور نیا عالمی نظام زر کس طرح طے کیا جائے جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو "طلائی نظام" میں تھیں۔ اس کانفرنس نے تین ادارے قائم کرنے کی تجویز منظور کی اور ایک نظام طے کیا گیا۔ پہلے ان تین اداروں کا مختصر تعارف ذکر کیا جاتا ہے' پھر نظام پر گفتگو ہوگی۔

بریٹن ووڈز کانفرنس کے تین ادارے

(۱) پہلا ادارہ جس کا قیام اس کانفرنس میں طے پایا تھا وہ ہے "بین الاقوامی تجارتی تنظیم" (International Trade Organization) جس کو عربی میں "منظمة التجارة الدولیة" کہتے ہیں۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک یہ نظریہ بہت مقبول تھا کہ ہر ملک اقتصادی ترقی کے لئے اپنا سونا بڑھائے اور اس کے لئے برآمدات کو فروغ دے اور درآمدات میں رکاوٹیں ڈالے' اس نظریئے کو موکنٹائل ازم (Mercantilism) اور عربی میں "مذہب التجارتین" کہتے ہیں۔ لیکن بعد میں یہ نظریہ کامیاب نہ ہوا اور یہ نظریہ مقبول ہوا کہ اقتصادی ترقی کے لئے بین الاقوامی تجارت کو فروغ دیا جائے اور درآمدات پر ایسی پابندیاں نہ لگائی جائیں جو بین الاقوامی تجارت میں رکاوٹ ڈالیں۔ اسی نظریئے کے پیش نظر اس کانفرنس میں مذکورہ ادارے کا قیام طے ہوا۔جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ ادارہ بین الاقوامی تجارت میں حائل رکاوٹوں کو ختم کرنے کا انتظام کرے گا' مگر امریکہ اس ادارے کے قیام کا مخالف تھا۔اس لئے کہ امریکہ ایک زرعی ملک ہے' اگر بین الاقوامی تجارت کو فروغ ہوتا تو یورپ کا مال سستے دام پر امریکہ میں آتا اور کسان زراعت کو چھوڑ کر تجارت کی طرف متوجہ ہوتے۔اس سے امریکہ کی زرعی پالیسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ ایک عرصے تک اس ادارے کا قیام امریکہ اور دوسرے ممالک میں باعث نزاع بنا رہا۔دوسرے ممالک اس ادارے کے قیام کا مطالبہ کرتے تھے اور امریکہ انکار کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء میں باہمی مصالحت ہوئی اور اس کے نتیجے میں ایک اور ادارہ وجود میں آیا۔جس کو (General Agreement on Tariff and Trade) (جنرل اگری مینٹ آن ٹیرف اینڈ ٹریڈ) کہتے ہیں جس کے معنی اردو میں یوں کئے جاسکتے ہیں "محصولات و تجارت کا معاہدہ عام" اس ادارے کو تخفیفاً (GATT) (گیٹ) کہتے ہیں عربی میں اس ادارے کو "الاتفاقیة العامة للتصرفات الجمرکیة والتجارة" کہتے ہیں۔

اس معاہدے سے زرعی اجناس کو مستثنیٰ کرلیا گیا تھا۔زرعی اجناس کے علاوہ دیگر مصنوعات میں بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کے لئے یہ اصول طے ہوئے۔

(۱) کوئی ملک بین الاقوامی تجارت میں کوئی پابندی یا رکاوٹ عائد کرے تو دوسرے ممالک اس رکاوٹ کو ختم کرانے کے لئے "گیٹ" میں آواز اٹھاسکیں گے اور جو ملک اس "گیٹ" کے ممبر ہیں ان پر "گیٹ" کے فیصلے پر عملدرآمد کرنا ضروری ہوگا۔ تجارت میں رکاوٹیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ (۱) محصولاتی رکاوٹیں۔کوئی ملک کسی ملک کی مصنوعات پر زیادہ محصول لگاتا ہے' جس کی وجہ سے اس ملک کی مصنوعات اس ملک میں مہنگی ہوجاتی ہیں

اور ان کی خرید و فروخت کم ہوتی ہے۔(۲) غیر محصولاتی رکاوٹیں۔ محصول کے علاوہ کوئی اور پابندی ایسی لگادی جائے جس کی وجہ سے دوسرے ممالک کی مصنوعات منگوانے میں لوگ تنگی محسوس کریں۔ مثلاً فرانس نے جاپان کے وی سی آر پر یہ پابندی لگادی تھی کہ یہ صرف فلاں چھوٹے پورٹ سے ہی آسکے گا۔

(۲) دوسرا اصول یہ طے ہوا کہ کوئی ملک کسی ملک کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کرے گا۔ اگر کوئی ملک ایک ملک کے ساتھ بہتر طریقے سے تجارت کرے اور دوسرے ملک کے ساتھ اور طریقے سے تجارت کرے تو یہ ملک گیٹ میں آواز اٹھاسکے گا۔

(۳) کسی ملک پر امتیازی محصول نہیں لگایا جائے گا۔ اگر کسی ملک پر امتیازی محصول لگایا گیا تو وہ "گیٹ" میں آواز اٹھا سکتا ہے۔

(۴) غریب ممالک کو بیرونی مصنوعات پر محصول زیادہ لگانے کی اجازت ہوگی' اس لئے کہ غریب ممالک بھی اگر محصول کم رکھیں گے تو بیرونی مصنوعات سستی ملیں گی۔ جس کی وجہ سے ملکی مصنوعات کی مانگ کم پڑے گی اور ملکی صنعت کو نقصان پہنچے گا۔

(۵) اگر دو ممالک میں تجارتی نزاع پیدا ہو گا تو "گیٹ" کے ذریعے باہمی افہام و تفہیم سے حل کیا جائے گا۔

عالمی مالیاتی فنڈ

(۲)____ دوسرا ادارہ جو وضع ہوا۔ وہ "عالمی مالیاتی فنڈ" تھا جس کو عربی میں "صندوق النقد الدولي" اور انگریزی میں (International Monetary Fund) کہتے ہیں۔ آسانی کے لئے آئی 'ایم 'ایف (I.M.F) سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اس کا قیام طے ہوا اور یہ ۱۹۴۸ء میں وجود میں آیا۔

جس طرح ایک ملک کے کئی بنکوں کا ایک مرکزی بنک "سنٹرل بنک" ہوتا ہے ایسے ہی کئی ممالک کے سنٹرل بنکوں کا مرکزی بنک یہ ادارہ ہے۔ گویا یہ پوری دنیا کا ایک مرکزی بنک ہے' جو وقتی ادائیگیوں کے لئے ملکوں کو قلیل المیعاد قرضے دیتا ہے۔ کبھی کسی ملک کی مالی حالت تو مستحکم ہوتی ہے مگر وقتی طور پر کسی تجارت کی ادائگی کیلئے نقد پیسے اسکے پاس نہیں ہوتے۔ ایسے موقع پر یہ ادارہ قرضہ فراہم کرتا ہے۔

اس ادارے میں ہر ملک کا ایک "کوٹا" (Quota) ہوتا ہے۔ یہ کوٹہ اس ملک کی تجارت کا عالمی تجارت کے ساتھ تناسب دیکھ کر مقرر کیا جاتا ہے۔ مثلاً عالمی تجارت ایک ارب ڈالر کی ہوئی اور کسی ملک کی تجارت پانچ کروڑ ڈالر کی ہے تو اس ملک کو پانچ فیصد کوٹا

ملے گا۔ اس کوٹے کی شرح میں کمی بیشی بھی ہوتی رہتی ہے۔ پھر اس کوٹے کی رقم ڈالر میں بیان کی جاتی ہے۔ یعنی جس ملک کا کوٹا پانچ فیصد ہے، اس کے بارے میں یہ متعین ہوتا ہے کہ اس کا مطلب اتنے ڈالر ہیں۔ ہر ملک اپنے کوٹے کا ۲۵ فیصد سونے میں اور ۷۵ فیصد اپنے ملک کی کرنسی میں ادارے کے پاس جمع کراتا ہے۔ اس طرح آئی 'ایم' ایف کے پاس کچھ سونا اور تمام ممالک کی کرنسیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ ہر ملک کو آئی 'ایم' ایف میں فنڈ جمع کرانے پر ادارے سے قرض لینے کا حق ملتا ہے، جس کو (Drawing Rights) اور عربی میں "حقوق السحب" کہا جاتا ہے۔ جمع کرائی ہوئی رقم کی متناسب شرح پر قرض کا حق ملتا ہے مثلاً یہ کہ ہر ملک اپنی جمع کرائی ہوئی رقم کا پانچ گنا قرض لے سکے گا۔ اور یہ شرح بدلتی بھی رہتی ہے۔ پھر (Drawing Rights) پر جو قرضہ ملتا ہے، اس کو کئی حصوں پر تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ ہر حصے کو ٹرانچ (Tranche)[1] کہتے ہیں۔ پہلی ٹرانچ اس قرضے کا ۲۵ فیصد ہوتا ہے جس کے لینے کا کسی ملک کو حق ہوتا ہے، اس ٹرانچ پر قرضہ بغیر کسی شرط کے ملتا ہے اور سود بھی کم ہوتا ہے۔ اس ٹرانچ کو Gold Tranche کہتے ہیں۔ اس کے بعد والی ٹرانچوں میں قرض لینے میں مشکلات درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی ہیں۔ آئی 'ایم' ایف قرض دینے کے لئے بہت سی شرائط عائد کرتا ہے، ان ٹرانچوں میں سود بھی بڑھتا جاتا ہے اور قرضے قلیل المیعاد ملتے ہیں۔ ان ٹرانچوں کو Conditionality tranches کہتے ہیں۔

اس ادارے کی پالیسیاں ممبر ممالک کی ووٹنگ سے طے ہوتی ہیں۔ اور ووٹنگ کا حق ممالک کی تعداد پر نہیں، بلکہ کوٹے کی بنیاد پر ملتا ہے۔ جس کا کوٹا زیادہ اس کو ووٹنگ کا حق بھی زیادہ ملتا ہے اور جس کا کوٹہ کم ہے اس کو ووٹنگ کا حق بھی کم ہوتا ہے۔ آئی 'ایم' ایف میں ایک اور اکاؤنٹ ہوتا ہے جس کو (Special Drawing Rights) (S.D.R) اور عربی میں "حقوق السحب الخاصة" کہتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ممبران طے کر لیتے ہیں کہ اس سال مجوزہ قرضوں کے علاوہ مزید اتنے قرضے اور دیئے جا سکتے ہیں۔ مزید قرضوں کو ممالک پر تقسیم کا تناسب بھی کوٹے کی شرح کے مطابق ہوتا ہے۔

عالمی بنک

(۳)۔۔۔ تیسرا ادارہ جس کا قیام "بریٹن ووڈز کانفرنس" میں طے ہوا۔ اس کا نام (International Bank For Reconstruction and Development) تھا۔ جس

---

[1] فرانسیسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی قاش اور ٹکڑے کے ہیں۔

کو(I.B.R.D) بھی کہتے ہیں۔ جس کو عربی میں "البنک الدولی للانشاء والتعمیر" کہتے ہیں۔ آسانی کے لئے اس کا مختصر نام(World Bank) (ورلڈ بنک) ہے۔ اب یہی نام زیادہ معروف ہے 'پہلا نام معروف نہیں' مگر اصل نام وہی طے ہوا تھا۔

اس ادارے میں اور آئی 'ایم 'ایف میں فرق یہ ہے کہ آئی 'ایم 'ایف قلیل المیعاد قرضے دیتا ہے 'جس کی مدت تین سے پانچ سال تک ہوتی ہے اور ورلڈ بنک طویل المیعاد قرضے دیتا ہے جس کی مدت پندرہ سے تیس سال تک ہوتی ہے۔ ابتداءً اس ادارے نے مشروعات (پراجیکٹس) کے لئے قرضے دیئے 'جیسے شاہراہیں بنانا وغیرہ۔ پھر ۱۹۶۰ء کے بعد عمومی قرضے دینے بھی شروع کر دیئے 'اب یہ ادارہ پالیسی ساز قرضے بھی دیتا ہے۔ یعنی یوں کہتا ہے کہ اگر تم ملک کی پالیسی اس طرح بناؤ تو اتنا قرضہ ملے گا۔

بریٹن ووڈز کا نظام شرح مبادلہ

بریٹن ووڈز کانفرنس میں جو تین ادارے طے پائے تھے 'ان کا تعارف تو ہو چکا ہے 'اسی کانفرنس میں کرنسیوں کے مبادلے کا جو نظام طے ہوا اس کی وضاحت یہ ہے۔

۱۹۳۱ء میں طلائی نظام تو ختم ہو چکا تھا 'اس کانفرنس میں شرح مبادلہ کا ایک اور نیا نظام طے پایا جو(Brettonwoods System of Exchange Rate) کے نام سے معروف ہے۔ اس نظام کا حاصل یہ ہے کہ اب بھی کرنسی کی قدر کا پیمانہ تو بنیادی طور پر سونا ہی رہا 'مگر ہر ملک کی کرنسی پر سونا نہیں ملتا تھا 'بلکہ اب بین الاقوامی تجارت میں آلۂ تبادلہ ڈالر کو قرار دیا گیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ امریکہ کے ڈالر کو سونے سے وابستہ کر دیا گیا 'اس لئے کہ امریکہ کی حالت مستحکم تھی وہ ڈالر پر سونا دینے کو تیار تھا 'چنانچہ ابتداءً ایک اونس سونے کے مقابلے میں ۳۵ ڈالر ہوتے تھے 'اس کے بعد امریکہ نے ڈالر کی قیمت بڑھا دی اور ۴۲ ڈالر پر ایک اونس سونا ملنے لگا 'صرف ہر ملک کا مرکزی بنک امریکہ کو ڈالر دے کر اس سے سونا لے سکتا تھا اور امریکہ دینے کو تیار تھا 'مگر عملی طور پر عموماً سونا کوئی ملک بھی نہیں لیتا تھا 'ڈالر سے ہی کاروبار چلتا تھا 'اس طرح ڈالر سونے سے وابستہ تھا۔ اور باقی تمام ممالک کی کرنسیوں کو ڈالر سے وابستہ کر دیا گیا تھا 'اور آئی 'ایم 'ایف میں معاہدہ اس طرح طے پایا کہ "ہر ملک اپنی کرنسی کی شرح بیک وقت ڈالر اور سونے دونوں سے بتائے گا" مثلاً اتنے روپے میں ڈالر ہوگا اور ان روپوں کے عوض سونا اتنا ہوگا 'مگر عملاً کرنسی کی شرح صرف ڈالر سے بتائی گئی۔ اس طرح تمام کرنسیاں ڈالر سے اور ڈالر سونے سے وابستہ ہوا۔

آئی 'ایم 'ایف میں یہ معاہدہ بھی طے ہوا کہ کسی ملک کی کرنسی کی جو قیمت ڈالر سے طے ہوئی ہے اگر ملک کی کرنسی کی قیمت میں اتار چڑھاؤ ہوا تو وہ اتار چڑھاؤ اگر دو فیصد

تک ہے تو گوارا ہے۔ یعنی کرنسی کی قیمت طے شدہ ریٹ سے دو فیصد کم یا دو فیصد زیادہ ہوگئی تو یہ گوارا ہے' لیکن اگر کرنسی کی قیمت دو فیصد سے زیادہ بڑھ گئی یا گر گئی تو مرکزی بنک قیمتوں پر اثر انداز ہو کر کرنسی کو طے شدہ قیمت پر لائے گا۔ مرکزی بنک کے اثر انداز ہونے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اگر کرنسی کی قیمت بازار میں طے شدہ ریٹ سے کم ہوگئی ہے تو مرکزی بنک زیادہ قیمت پر لوگوں سے کرنسی خریدنے لگ جائے گا تو بڑی حد تک امید ہے کہ قیمت بڑھ جائے گی اور اگر کرنسی کی قیمت بازار میں طے شدہ ریٹ سے زیادہ ہوگئی تو مرکزی بنک کم قیمت پر فروخت کرنے لگے گا' جس کے نتیجے میں قیمت کے کم ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ اگر اس طریقے سے بھی ریٹ کنٹرول نہ ہو تو آئی' ایم' ایف سے رجوع کیا جائے گا۔ آئی' ایم' ایف یا تو ریٹ کنٹرول کرنے کیلئے مزید ڈالر دے گا یا اس ملک کی کرنسی کا ریٹ بدل دے گا۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات سامنے آگئی کہ بریٹن ووڈز کے اس نظام میں شرح مبادلہ (Exchange Rate) طے شدہ (Fixed) ہے۔ اس لئے اس نظام کو انگریزی میں (Fixed Exchange Rate System) اور عربی میں "نظام سعر الصرف الثابت" کہتے ہیں۔ اس سے پہلے شرح مبادلہ کا جو طلائی نظام جاری تھا اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ اس میں کرنسی کے پیچھے سونے کی مقدار طے شدہ ہوتی تھی اور ریٹ ایک ہی (Fixed) رہتا تھا جس کی وجہ سے ہر تاجر کرنسی کے ریٹ میں اتار چڑھاؤ کے اندیشے کے بغیر پُر اعتماد ہو کر تجارت کرتا تھا۔ بریٹن ووڈز کے اس نظام میں بھی طلائی نظام کی اس خوبی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طلائی نظام میں ایک سقم تھا' اس سے اجتناب کا راستہ نکالا گیا ہے۔ وہ سقم یہ تھا کہ طلائی نظام میں شرح مبادلہ کی تبدیلی میں حکومت کا عمل دخل نہیں تھا۔ بریٹن ووڈز کے مذکورہ نظام میں شرح مبادلہ میں تبدیلی کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔

بریٹن ووڈز کے نظام کا زوال

مذکورہ بالا نظام کا مدار اس بات پر تھا کہ کوئی ایک متمول ملک اپنی کرنسی پر سونا دینے کے لئے تیار ہو' چنانچہ اس وقت امریکہ اس کے لئے تیار تھا کہ ڈالر کے بدلے سونا دے گا مگر عملاً امریکہ سے سونے کا مطالبہ کوئی بھی نہیں کرتا تھا' البتہ فرانس نے امریکہ سے ڈالر پر سونے کا مطالبہ شروع کیا جس سے فرانس اور امریکہ کے حالات بھی سازگار نہیں رہے۔ اور امریکہ کے پاس سونے کا ذخیرہ کم ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۱ء میں امریکہ نے سونا دینے سے انکار کر دیا اور بریٹن ووڈز کا نظام ختم ہوگیا۔ طے شدہ شرح مبادلہ کا نظام (Fixed Exchange Rate System) قائم نہ رہا۔ اب شرح مبادلہ

کے نظام کیلئے دو نظریئے سامنے آئے۔ (۱) ایک نظریہ یہ کہ جیسے باقی اجناس کا کوئی ریٹ طے نہیں ہوتا' بلکہ آزاد بازار خود ہی طلب و رسد کی بنیاد پر ریٹ طے کرتا ہے' ایسے ہی کرنسی کے ریٹ کو بھی کھلے بازار پر چھوڑ دیا جائے' طلب و رسد کی بنیاد پر خود ہی ریٹ طے ہوتا رہے گا۔ مثلاً ڈالر اور پاکستانی روپے کی طلب و رسد سے پاکستانی روپے کا ڈالر کے ساتھ ریٹ طے ہو گا۔ بین الاقوامی تجارتی منڈی میں طلب و رسد سے باقی کرنسیوں کے ساتھ پاکستانی روپے کا ریٹ طے ہو گا۔ اس نظریئے کو (Freely Floating Exchange Rates) کا نظریہ کہتے ہیں۔ اور عربی میں "اسعار الصرف العائمة الحرة" کہتے ہیں۔
(۲) دوسرا نظریہ یہ تھا کہ اصولی طور پر تو ریٹ آزاد ہی رہنا چاہئے تاہم اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو چاہئے کہ وہ ریٹ پر نگاہ رکھے۔ اگر کبھی ریٹ میں بہت زیادہ افراط یا تفریط ہونے لگے تو حکومت مداخلت کرے۔ جس کا طریقہ یہ ہو گا کہ اسٹیٹ بنک کو کہے کہ وہ بازار میں آکر قیمتوں پر اثر انداز ہو۔ اس نظریئے کو انگریزی میں (Managed Float) کا نظریہ کہتے ہیں۔ عربی میں "اسعار الصرف العائمة المدارة" کہہ سکتے ہیں۔

کاغذی نوٹ کی حیثیت اور اس کے فقہی احکام

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات سامنے آئی کہ کاغذی نوٹ پر کئی ادوار گزرے ہیں۔ پہلے اس کے پیچھے مکمل طور پر سونا ہوتا تھا' جس کو (Gold Bullion Standard) کہتے ہیں۔ پھر (Fiduciary Money) کا دور آیا جب کہ ان کے پیچھے مکمل طور پر تو سونا نہیں ہوتا تھا' لیکن مخصوص تناسب سے سونا ہوتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ تمام کرنسیاں ڈالر سے وابستہ تھیں اور ڈالر سونے سے وابستہ تھا' پھر ۱۹۷۱ء کے بعد امریکہ نے بھی سونا دینے سے انکار کر دیا تو اب اس نوٹ کے پیچھے کوئی چیز نہیں رہی' نوٹ پر لکھی ہوئی عبارت "حامل ہذا کو مطالبہ پر اتنے روپے ادا کئے جائیں گے" بے معنی ہو گئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اب اس کے آلۂ تبادلہ ہونے پر اصطلاح محض ہے' اس کے پیچھے کچھ بھی نہیں ہے۔

اب موجودہ صورتحال میں کاغذی نوٹ کی حیثیت کیا ہے؟ اسکی دو تشریحیں کی جاتی ہیں۔

(۱) زیادہ ماہرین معاشیات یہ کہتے ہیں کہ نوٹ کے پیچھے سونا اس لئے رکھا جاتا تھا کہ سونا بطور آلۂ تبادلہ کے متعارف ہو گیا تھا' ہر جگہ اور ہر ملک میں اس کی بنیاد پر تجارت ہو سکتی تھی۔ اگر یہی مقصد کاغذی نوٹ سے سونے کو واسطہ بنائے بغیر حاصل ہو جائے اور وہ بطور

آلۂ تبادلہ کے متعارف ہو جائے تو سونے کو واسطہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ اس رائے کے مطابق نوٹ ایک خاص قوت خرید سے عبارت ہے۔ یعنی اس نوٹ سے اتنی قیمت کی اشیاء خریدی جا سکتی ہیں، تو اب نوٹ کے پیچھے سونے کی بجائے غیر متعین، متفرق اشیاء کا مجموعہ ہے۔ جس کو انگریزی میں (Basket of Goods) اور عربی میں "سلة البضائع" کہتے ہیں۔

(2) دوسری تشریح جو فقہی مزاج کے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ نوٹ کو زر اصطلاحی اور ثمن عرفی قرار دیدیا گیا ہے، یعنی اگرچہ اس کاغذ کی ذاتی قدر نہیں، لیکن اصطلاحاً اس کو ایک مخصوص مالیت کا آلۂ تبادلہ قرار دیدیا گیا۔

نوٹ کی فقہی حیثیت۔

نوٹ کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں علماء کے کئی نقطۂ نظر ہیں۔

(۱)۔۔۔۔ ماضیٔ قریب میں علمائے ہندوستان میں سے اکثر کی رائے یہ رہی کہ نوٹ خود مال نہیں، بلکہ دَین کی رسید ہے۔ کسی کو نوٹ دینا دین کا حوالہ ہے۔ اس پر کئی مسائل متفرع ہوئے۔ مثلاً یہ کہ نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، جب تک کہ فقیر اس سے کوئی چیز نہ خرید لے، نوٹوں سے سونے اور چاندی کی خریداری جائز نہیں۔ اس لئے کہ نوٹ بھی سونے کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا یہ بیع صرف ہوئی اور جس نے نوٹ لئے ہیں اس نے سونے پر ابھی قبضہ نہیں کیا، لہٰذا التقابض فی المجلس نہ ہوا جو بیع صرف کے جواز کی شرط ہے، بلکہ اس رائے کے مطابق تو دو نوٹوں کا آپس میں تبادلہ بھی جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ بیع الدین بالدین (بیع الکالئ بالکالئ) ہے جو ناجائز ہے۔

یہ نقطۂ نظر کسی زمانے میں درست تھا، مگر اب بوجوہ درست نہیں رہا۔ اس لئے کہ اب نوٹوں کے پیچھے سونا نہیں ہوتا، بلکہ خود انہی کو ثمن قرار دیدیا گیا ہے، لہٰذا ان کو رسید کہنا مشکل ہے۔

(۲)۔۔۔۔ ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ ایک روپیہ کا نوٹ خود مال ہے اور باقی نوٹ اس کی رسیدیں ہیں۔ یہ رائے نظریاتی طور پر تو درست ہو سکتی ہے، اس لئے کہ ایک روپیہ کے نوٹ میں اور باقی نوٹوں میں فرق ہے۔ ایک روپیہ کا نوٹ حکومت جاری کرتی ہے اور باقی نوٹ اسٹیٹ بنک جاری کرتا ہے۔ بڑے نوٹوں پر یہ لکھا ہوا ہوتا ہے "حامل ہذا کو مطالبہ پر اتنے روپے دیئے جائیں گے" ایک روپے کے نوٹ پر یہ بات لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ حکومت کو جب پیسے کی ضرورت ہوتی ہے تو حکومت اسٹیٹ بنک سے قرض لیتی ہے، اسٹیٹ بنک نوٹ چھاپ کر قرض دیتا ہے۔ اس فرق کی اس کے علاوہ اور کوئی تشریح بظاہر ممکن نہیں کہ ایک روپے کا نوٹ خود مال ہے اور باقی نوٹ اس کی رسیدیں ہیں، مگر عملی طور پر

بات یوں نہیں ہے۔ اس لئے کہ بڑے نوٹ اس بات کو دیکھ کر نہیں چھاپے جاتے کہ ایک روپے کے نوٹ کتنی مقدار میں ہیں' اتنے ہی بڑے نوٹ چھاپے جائیں بڑے نوٹوں کا ایک روپے کے نوٹوں سے ربط نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ کسی چیز کو ثمن عرفی قرار دینے کے لئے اس قسم کی کوئی شرط نہیں ہے کہ وہ کیا چیز ہے لہٰذا اگر کسی رسید کو ثمن قرار دیدیا جائے تو اس پر بھی ثمن عرفی کے احکام جاری کئے جانے چاہئیں۔

(۳)۔۔۔۔ اکثر علمائے عرب کی رائے یہ ہے کہ نوٹ ذہب اور فضہ کے قائم مقام ہیں جو احکام سونے' چاندی کے ہیں وہی نوٹوں کے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سونا' چاندی تو آلۂ تبادلہ نہیں رہے۔ سونے' چاندی کی جگہ اب نوٹوں نے لے لی ہے' لہٰذا زکواۃ' بیع صَرف اور ربوا وغیرہ تمام مسائل میں نوٹوں کا حکم سونے' چاندی والا ہو گا۔ علمائے عرب میں سے بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سونا' چاندی اب ثمن نہیں رہے' بلکہ عروض ہیں' ان پر عروض والے احکام جاری ہوں گے۔ یہ نظریہ اس نقطۂ نظر پر مبنی ہے کہ کوئی چیز بھی ثمن خلقی نہیں ہوتی' کسی چیز کو لوگ آلۂ تبادلہ کے طور پر قبول کرنے لگیں تو وہ ثمن ہے' یہ مقبولیت ختم ہو جائے تو اس کی ثمنیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

یہ نقطۂ نظر بھی درست معلوم نہیں ہوتا' اس لئے کہ سونے' چاندی اور نوٹوں میں فرق ہے۔ سونے' چاندی کو ثمن خلقی کہا جائے یا نہ کہا جائے یہ الگ بات ہے' لیکن اتنی بات طے شدہ ہے کہ سونے' چاندی کو شریعت نے ثمن حقیقی قرار دیا ہے۔ ثمن حقیقی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی ثمنیت اس کے عرفاً آلۂ تبادلہ کے طور پر معتبر ہونے کے ساتھ وابستہ نہیں۔ لوگ اس کو آلہ تبادلہ اعتبار کریں یا بطور سلعہ استعمال کریں شرعاً اس کا حکم ایک ہی ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ سونے' چاندی کا زیور سونے' چاندی کے بدلے میں بیچا جائے تو بھی اس پر صَرف کے احکام جاری ہوں گے' حالانکہ یہاں یہ آلۂ تبادلہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ سونا اور چاندی ثمنِ حقیقی اور ثمنِ شرعی ہیں' جب کہ نوٹ اعتباری ثمن ہیں' لہٰذا نوٹوں کو سونے' چاندی کے قائم مقام قرار دینا بھی صحیح نہیں' اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ سونے' چاندی کی ثمنیت ختم ہو چکی ہے۔

(۴)۔۔۔۔ صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوٹ رسید نہیں بلکہ خود مال ہیں' سونے چاندی کی طرح ثمن حقیقی نہیں بلکہ ثمن عرفی ہیں' ان کا حکم وہی ہو گا جو فلوس کا ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق نوٹوں کے مسائل کی اجمالی وضاحت یہ ہے۔

<u>نوٹ چونکہ خود مال ہیں' لہٰذا ان کے دینے سے زکواۃ ادا ہو جاتی ہے</u>' اور ان کا آپس میں تبادلۂ بیع صَرف نہیں ہو گا' جب یہ معلوم ہو گیا کہ نوٹوں کا تبادلہ صَرف نہیں' تو

ان کے باہمی تبادلے کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نوٹوں کے تبادلے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک ہی ملک کے دو نوٹوں میں تبادلہ ہو۔ جیسے سو کے پاکستانی نوٹ کا تبادلہ دس دس روپے کے دس نوٹوں سے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ ہو۔

پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ چونکہ یہ بیع صرف نہیں' اس لئے تقابض فی المجلس تو ضروری نہیں' تاہم احد البدلین پر مجلس میں قبضہ ضروری ہے تاکہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تبادلے میں تفاضل جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً سو روپے کا تبادلہ نوے روپے سے جائز ہے یا نہیں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اگر دونوں بدل غیر متعین ہوں تو حنفیہ کے تینوں ائمہ کے ہاں تفاضل جائز نہیں' اس لئے کہ فلوس میں جودت رداءت کا تو اعتبار ہے نہیں' لہٰذا یہ امثال متساویہ ہیں قطعاً۔ یہاں ایک بدل کی زیادتی دوسرے بدل کے وصف جودۃ کے مقابلے میں تو ہو نہیں سکتی' اس لئے کہ وصف جودۃ ہدر ہے' لہٰذا یہ زیادتی خالی عن العوض ہے' اسی کو ربوا کہتے ہیں ——— اگر دونوں بدل متعین ہوں تو شیخین کے ہاں تفاضل جائز ہے۔ ان کے ہاں متعاقدین کی تعیین سے ان کی ثمنیت باطل ہوگئی' اب یہ عروض بن گئے ہیں' اس لئے ان میں تفاضل جائز ہے۔ امام محمدؒ کے ہاں اس صورت میں بھی تفاضل جائز نہیں' ان کی تعین سے ان کی ثمنیت باطل نہیں ہوتی۔ آج کل امام محمدؒ کی رائے پر ہی فتویٰ دینا چاہئے' اس لئے کہ اگر شیخین کا قول اختیار کر لیا جائے تو ربوا کا دروازہ کھل جائے گا۔ چنانچہ فقہائے متقدمین میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ فقہائے ماوراءالنہر نے "عدالی" اور "غطارفہ" میں تفاضل کی حرمت کا فتویٰ دیا تھا' حالانکہ ان میں غش غالب ہوتا تھا اور ایسے نقود میں اصل مذہب کے مطابق تفاضل جائز ہے۔ سد باب ربوا کے لئے تفاضل کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ایسے ہی فلوس میں تفاضل کے بارے میں بھی امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دینا چاہئے۔ لہٰذا ایک ملک کے نوٹوں کی بیع میں تفاضل جائز نہیں' تماثل ضروری ہے۔ اور یہ تماثل نوٹوں کی گنتی سے نہیں ہوگا' بلکہ ان پر لکھی ہوئی قیمت (Face Value) کے مطابق ہوگا۔

دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ دو ملکوں کی کرنسی کے تبادلے میں تفاضل جائز ہے' بشرطیکہ احد البدلین پر قبضہ ہو جائے۔ اس لئے کہ دو ملکوں کی کرنسیوں کی جنس مختلف ہوتی ہے' کیونکہ خود نوٹ تو مقصود ہوتے نہیں' بلکہ یہ مخصوص قوت خرید کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور ہر ملک کی کرنسی کی قوت خرید مختلف ہوتی ہے' لہٰذا ہر ملک کی کرنسی الگ جنس شمار ہوگی اور ان کے باہمی تبادلے میں تفاضل جائز ہے۔

حکومتیں بھی دوسرے ممالک کی کرنسیوں کا اپنے ملک کی کرنسی سے ریٹ طے

کر دیتی ہیں۔اس ریٹ سے کم وبیش پر معاملہ کرنا سود تو نہیں' البتہ خلاف قانون ہونے اور امام کی جائز امور میں اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے گناہ ہے۔اس مسئلے کی مزید تفصیل احقر کے رسالے "احکام الاوراق النقدیہ" میں موجود ہے جس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

قدر زر' افراط وتفریط زر اور قیمتوں کا اشاریہ

سابقہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کاغذی نوٹ (Paper Currency) کی اپنی حقیقی قدر کچھ نہیں' یہ کچھ اشیاء وخدمات (Goods and Services) کی قوت خرید کی نمائندگی کرتے ہیں۔اسی قوت خرید کو "زر کی قدر" (Value of Money) کہتے ہیں۔نوٹ کی قدر کا تعین اشیاء وخدمات کی قیمتوں سے ہوتا ہے۔اشیاء وخدمات کی قیمتیں کم ہو جائیں تو نوٹ کی قدر بڑھ جاتی ہے۔اور اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں تو نوٹ کی قدر کم ہو جاتی ہے۔لہٰذا اشیاء وخدمات کی قیمتیں اور نوٹ کی قدر دونوں متضاد سمتوں میں سفر کرتے ہیں ــــــــ جب "زر" کا پھیلاؤ زیادہ ہو جائے تو اشیاء کی طلب بڑھتی ہے' جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے زر کی قدر میں کمی آجاتی ہے۔اس صورتحال کو اردو میں "افراط زر" اور عربی میں "تضخم" اور انگریزی میں (Inflation) کہتے ہیں۔پھر اصطلاح میں عموم ہوا تو اس کو اشیاء کی قیمتوں میں ہر اضافے کے لئے استعمال کرتے ہیں' خواہ وہ اضافہ زر کے زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے ہو یا دیگر عوامل کی وجہ سے ہو۔اگر افراط زر (قیمتوں میں اضافہ) اشیاء کی طلب بڑھ جانے کی وجہ سے ہو تو اسکو (Demand Pull inflation) اور عربی میں "تضخم بسبب الطلب" کہتے ہیں۔اور اگر افراط زر اشیاء کی تیاری کے مصارف میں اضافے کی وجہ سے ہو مثلاً مزدور کی اجرت بڑھ جانے کی وجہ سے تو اسکو (Cost Push inflation) اور عربی میں "تضخم بسبب رفع الاسعار" کہتے ہیں ــــــــ اسکے برعکس اگر قیمتوں میں کمی ہو جائے اور زر کی قدر میں اضافہ ہو تو اس کو اردو میں تفریط زر' عربی میں "انکماش" اور انگریزی میں (Deflation) کہتے ہیں۔

قیمتوں کا اشاریہ

زر کی قدر' افراط زر اور تفریط زر کی پیمائش اشیاء وخدمات کی قیمتوں سے ہوتی ہے۔اشیاء کی قیمتوں کو دیکھ کر قدر زر اور افراط زر یا تفریط زر کی پیمائش کے لئے ایک حسابی نظام ہے جس کو عربی میں "قائمة الاسعار" اردو میں "قیمتوں کا اشاریہ" اور انگریزی میں

(Price Index) کہتے ہیں۔

اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی اشیاء جو عام ضرورت کی ہیں اور ان کی قیمتوں میں کمی بیشی لوگوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے انکی فہرست بنائی جاتی ہے، پھر جس مدت کے دوران زر کی قدر میں کمی بیشی کا اندازہ لگانا ہے، اس مدت کی ابتداء اور انتہاء کی قیمتیں لے کر ان کا اوسط معلوم کیا جاتا ہے یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ اسی مدت کے دوران قیمتوں میں اوسطاً کتنے فیصد اضافہ یا کمی ہوئی۔ یہ قیمتوں میں اضافے یا کمی کی سادہ اوسط ہے، اس سے قدر زر کی صحیح پیمائش نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ یہ اوسط حاصل کرنے کے لئے تمام اشیاء کو یکساں رکھا گیا ہے، حالانکہ تمام اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی انسان کو یکساں طور پر متاثر نہیں کرتی۔ جن اشیاء کی ضرورت زیادہ پیش آتی ہے ان کی قیمتوں میں کمی بیشی زیادہ متاثر کرتی ہے اور جن کی اہمیت و ضرورت کم ہے ان کی قیمتوں میں کمی بیشی اتنی زیادہ متاثر نہیں کرتی۔ لہٰذا صحیح پیمائش کے لئے ہر شے کی اہمیت کے مطابق اس کو ایک وزن دیا جاتا ہے۔ اس وزن کو عربی میں "وزن البضائع" اور انگریزی میں (Weight of Commodity) کہتے ہیں۔ اس وزن کو سادہ اوسط میں ضرب دے کر جو اوسط حاصل ہو گا اس کو "وزن دار اوسط" کہتے ہیں۔ عربی میں "المعدل الموزون" اور انگریزی میں (Weighted Average) کہتے ہیں۔ اس موزون اوسط کا مجموعہ قیمتوں میں کمی بیشی کا اشاریہ ہو گا۔ اس سے قدر زر میں کمی بیشی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ درج ذیل خاکے سے (Price Index) کا اجمالی تصور ہو سکتا ہے۔

اشیاء	۱۹۹۱ء کی قیمت	۱۹۹۲ء کی قیمت	سادہ اوسط	وزن	موزون اوسط
کھانا	۵۰	۱۰۰	۲	٫۵	۱٫۰۰
کپڑا	۲۰	۳۰	۱٫۵	٫۲	٫۳
مکان	۳۰	۶۰	۲	٫۳	٫۶
			مجموعہ کی اوسط = ۱٫۸۳		مجموعہ = ۱٫۹

سادہ اوسط سے یہ معلوم ہوا کہ قیمتیں ایک سے ۱٫۸۳ ہوگئی ہیں، لہٰذا قدر زر میں ۸۳ فیصد کی آئی اور موزون اوسط سے یہ معلوم ہوا کہ قیمتیں ایک سے ۱٫۹۰ ہوگئی ہیں، لہٰذا زر کی قدر میں ۹۰ فیصد کمی ہوئی۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ "قیمتوں کا اشاریہ" ایک تخمینی چیز ہے، تحقیقی نہیں، اس لئے کہ اس میں کونسی اشیاء لیتی ہیں اس کا فیصلہ تخمینی ہے پھر ہر شئے کو جو وزن دیا جاتا ہے وہ بھی تخمینی، ہر شے کی جو قیمت لی جاتی ہے وہ بھی تخمینی ہے۔

بسا اوقات کئی معاملات کو "قیمتوں کے اشاریئے" سے وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے کسی وقت پاکستان میں ملازمین کی تنخواہوں کو "قیمتوں کے اشاریئے" سے وابستہ کر دیا گیا تھا کہ روپے کی قدر میں جتنی کمی ہوگی 'اتنا ہی تنخواہوں میں اضافہ ہوگا۔ کسی چیز کی قیمتوں کے اشاریئے سے وابستہ کرنے کو "انڈیکیشن" (indexation) کہتے ہیں۔

افراط زر کا ادائیگیوں پر اثر

نوٹ کی ایک وہ قیمت ہے جو اس کے اوپر لکھی ہوئی ہوتی ہے 'اس کو "القیمة الاسمیة" (Face Value) کہتے ہیں۔ اور ایک قوت خرید ہے اس کو "القیمة الحقیقیة" (Real Value) کہتے ہیں۔ لکھی ہوئی قیمت تو ایک ہی رہتی ہے 'مگر حقیقی قیمت (قوت خرید) افراط زر کی صورت میں کم ہوتی ہے۔ اب کسی شخص کا دوسرے کے ذمے دین ہو تو وہ کچھ مدت کے بعد قیمت اسمیہ کے مطابق واپس کیا جائے یا قوت خرید کے مطابق؟ مثلاً کسی شخص کے دوسرے کے ذمے سو روپے تھے۔ ایک سال کے بعد سو روپے کی قوت خرید میں دس فیصد کی آگئی تو قیمت اسمیہ کے مطابق تو سو کا نوٹ ہی دینا ہوگا اور قیمت حقیقیہ کے مطابق ایک سو دس روپے دینے ہوں گے۔ یہ سوال آج کل بہت زیادہ اٹھ رہا ہے کہ ادائیگی قیمت اسمیہ کے لحاظ سے ہوگی یا قیمت حقیقیہ کے لحاظ سے؟ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیمت اسمیہ کیساتھ ادائیگی ہو تو اس میں قرض خواہ کا نقصان ہے اور اس پر ظلم ہے۔ خاص طور پر ان ممالک میں جہاں افراط زر کی شرح بہت تیز ہے۔ مثلاً بیروت کی کرنسی (لیرا) ایک وقت ڈالر کے قریب تھی اب اس کی قدر اتنی کم ہوگئی ہے کہ ایک ڈالر کے چھ سات سو لیرے ملتے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اقتصادیین اور علماء نے مختلف نقطۂ نظر اپنائے ہیں 'یہاں تمام نقطہ ہائے نظر ذکر کئے جاتے ہیں اور ان پر تبصرہ بھی کیا جاتا ہے۔

(۱)--- نوٹ قرض دیئے جائیں تو یہ دراصل وہ سونا قرض دیا گیا ہے 'جو اس کی پشت پر ہے۔ اب اسی مقدار کا سونا لینا اس کا حق ہے۔ وہ اتنا ہی سونا یا اس کی قیمت روپے میں لے سکتا ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر اس مفروضے پر مبنی ہے کہ نوٹ کی پشت پر سونا ہے۔ اور اس مفروضے کا غلط ہونا پہلے واضح ہو چکا ہے۔

(۲)--- نوٹ کی پشت پر سونا ہو یا نہ ہو 'بہر حال سمجھا یہی جائے گا کہ نوٹ کا لین دین دراصل سونے کا لین دین ہے 'اس لئے کہ پہلے سونا ثمن تھا اب نوٹوں نے سونے کی جگہ لے لی ہے 'لہٰذا نوٹ کا لین دین سونے کا لین دین ہے۔ لہٰذا ادائیگی سونے کی قیمت سے وابستہ ہے۔

یہ نقطۂ نظر بھی درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ اب نوٹ سونے کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں یہ خود ثمن عرفی ہے اور فلوس کی طرح ہیں ۔ ثمن عرفی اور فلوس کی اپنی ذاتی قدر کا اعتبار ہوتا ہے ' ان کو ادائیگی میں سونے سے وابستہ نہیں کیا جاتا ہے ۔ یہاں بعض لوگ حضرت امام ابو یوسف ﷺ کے مذہب سے استدلال کرتے ہیں ان کا مذہب یہ ہے کہ ادائیگی سے پہلے فلوس کی قیمت بڑھ گئی یا کم ہو گئی تو ادائیگی قیمت کے اعتبار سے ہو گی[1] لیکن یہ استدلال صحیح معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ نوٹ اور فلوس میں فرق ہے ۔ فلوس سونے چاندی سے مرتبط ہوتے تھے ' فلوس کی قیمت سونے چاندی کی بنیاد پر ہی طے ہوتی تھی ۔ لہٰذا ان فلوس کی حیثیت دنانیر اور دراھم کی ریز گاری کی طرح تھی اور فلوس کو دراھم و دنانیر کیساتھ ایک خاص نسبت ہوتی تھی ۔ مثلاً یہ کہ ایک فلس چاندی کے درھم کا عشر (دسواں حصہ) ہے ۔ بازار کی اصطلاح میں اس نسبت کے بدلنے کو ہی فلوس کی قیمت میں کمی بیشی سے تعبیر کرتے ہیں ۔ ایسی صورت میں جب کہ فلوس سونے چاندی سے مرتبط ہوں اور دراہم و دنانیر کے لئے ریز گاری کی طرح ہوں امام ابو یوسف " فلوس کی قیمت کی ادائیگی کو ضروری قرار دیتے ہیں ۔ نوٹوں کی صورتحال اس سے بالکل مختلف ہے ' یہ سونے چاندی سے مرتبط نہیں ' یہ مستقل ثمن اصطلاحی ہیں ' ان کی اپنی ایک قدر ہے جس کا سونے چاندی سے کوئی تعلق نہیں ۔

پھر اس زمانے کے فلوس اور نوٹوں میں ایک اور فرق بھی ہے ۔ وہ یہ کہ فلوس کی قیمت معلوم کرنے کے لئے ایک واضح معیار سونے چاندی کا موجود تھا ۔ جس کو سامنے رکھ کر فلوس کی قیمت تحقیقی طور پر معلوم کی جا سکتی تھی ' لیکن اب نوٹوں کی قدر کا تخمینی اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے ' قدر کا حقیقی علم نہیں ہو سکتا ۔ جیسا کہ قیمتوں کے اشاریے کے مضمون میں یہ بات واضح ہو چکی ہے ۔

(۳) تیسرا نقطۂ نظر جو زیادہ شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے وہ انڈیکسیشن کا نظریہ ہے ۔ یعنی ادائیگیوں کو "قیمتوں کے اشاریے" (Price Index) سے وابستہ کیا جائے ۔ اس نظریے کی دلیل یوں پیش کی جاتی ہے کہ نوٹ بذات خود کچھ نہیں یہ سلة البضائع "Basket of Goods) یعنی کچھ اشیاء کی ٹوکری کی قوت خرید کی نمائندگی کرتے ہیں لہٰذا جب کسی نے دوسرے کو کچھ نوٹ قرض دیئے تو گویا اس نے اس کو سلة البضائع (Basket of Goods) دی ہے ۔ " القرض تقضی بامثالھا " کا تقاضا یہ ہے کہ اب بھی (Basket of Goods) واپس کرے ' جس کا طریقہ یہی ہے کہ ادائیگی کو (Price Index) (قیمتوں کے

---

[1] رسائل ابن عابدین ص ۶۱ ج ۲

اشاریئے) سے وابستہ کیا جائے۔ یعنی ادائیگی کے وقت نوٹوں کی اتنی مقدار زیادہ ادا کی جائے جو افراطِ زر کی شرح کے مساوی ہو' مثلاً سو روپے قرض دیئے تھے' اور ادائیگی کے وقت افراطِ زر میں دس فیصد اضافہ ہوا تو اب ایک سو دس روپے ادا کئے جائیں۔

فقہی لحاظ سے یہ نقطۂ نظر بھی بوجوہ غلط ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اگر نوٹ کی پشت پر کچھ مخصوص اور متعین اشیاء ہوتیں تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ نوٹ دراصل "سلۃ البضائع" کی نمائندگی کرتا ہے' لیکن پیچھے واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ "سلۃ البضائع" کوئی متعین چیز نہیں' یہ افراد کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے اور اس کی تعیین کا کوئی طریقہ بجز تخمینے کے نہیں ہے' لہٰذا دراصل "سلۃ البضائع" نوٹ کی حقیقت نہیں' بلکہ اس سے حاصل ہونے والا فائدہ ہے۔ چنانچہ کسی کو نوٹ دینے کا مطلب "سلۃ البضائع" دینا نہیں بلکہ ایسا آلۂ تبادلہ دینا ہے جس سے "سلۃ البضائع" خریدی جا سکتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ ادائیگی میں مثلیت باعتبار قیمت حقیقیہ (Real Value) معتبر ہونی چاہئے۔ صرف قیمت اسمیہ (Face Value) میں مثلیت کا اعتبار درست نہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو بات اس کے برعکس ہے۔ شرعاً قرض کی ادائیگی میں مقدار میں مثلیت کا اعتبار ہے' حقیقی قیمت میں مثلیت کا اعتبار نہیں۔ مثلاً کسی نے گندم قرض لی' جب واپسی کا وقت آیا تو وہ گندم کی اتنی مقدار ہی واپس کرے گا خواہ قیمت کم ہو یا زیادہ؟ اس بات پر کہ اعتبار مقدار کا ہوتا ہے' حقیقی قیمت کا نہیں ایک کافی واضح دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے' جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ "نقیع" میں اونٹ بیچا کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیع دراہم پر ہوتی اور ادائیگی دنانیر میں ہوتی اور کبھی بیع دنانیر میں ہوتی اور ادائیگی دراہم میں ہوتی۔ اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تو آپ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ اداء کے دن کی قیمت کے مطابق ہو۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ ذمے میں تو اسی چیز کی مقدار واجب ہوئی ہے جس پر بیع ہوئی تھی' پھر ادا کے وقت اس دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دیون میں جو چیز واجب ہوتی ہے وہ دیون کی مقدار ہے نہ کہ قیمت' اگر قیمت واجب ہوتی تو وجوب کے دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہوتا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اموالِ ربویہ میں شریعت نے حقیقی مماثلت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس لئے شریعت نے اموالِ ربویہ میں مجازفہ کو جائز نہیں قرار دیا۔ اور ادائیگی کو

---

[1] ابو داؤد کتاب البیوع ص ۲۵ ج ۲ رقم ۳۳۵۴

"قیمتوں کے اشاریے" کے ساتھ وابستہ کرنے میں مجازفۃ لازم آتی ہے۔ اس لئے کہ یہ بات پہلے واضح ہو چکی ہے کہ "قیمتوں کا اشاریہ" تخمینی ہوتا ہے۔

رہا یہ اشکال کہ نوٹ کی قوت خرید کم ہونے کے بعد بھی نوٹوں کی اتنی ہی مقدار واپس کرنا جتنی لی تھی 'قرض خواہ پر ظلم ہے' اس کے جواب کے لئے درج ذیل باتیں ذہن میں رہنا مفید ہے۔

الف :۔ روپے کی قدر کم ہونے میں مستقرض کے بھی کسی فعل کا دخل نہیں' لہذا اس کی ذمہ داری اس پر ڈالنا اس پر ظلم ہے۔

ب :۔ کسی کو رقم دینے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کے منافع میں شریک ہونے کے لئے کسی کو رقم دی جائے 'تو منافع میں شریک ہونے کا طریقہ قرض نہیں' بلکہ شرکت یا مضاربت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہمدردی کے لئے کسی کو قرض دیا جائے۔ ہمدردی کے لئے کسی کو قرض دینا بالکل ایسے ہی ہے جیسے اپنے پاس رقم محفوظ کر لی جائے۔ اگر قرض دینے والا اپنے پاس رقم محفوظ رکھتا تو قدر میں کمی کا کوئی بھی ذمہ دار نہیں تھا' یہاں بھی کوئی ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ج :۔ اگر انڈیکیشن صحیح اصول ہے تو یہ بنکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں بھی جاری ہونا چاہئے' حالانکہ کرنٹ اکاؤنٹ میں اسے کوئی بھی جاری نہیں کرتا ہے۔

د :۔ افراط زر (inflation) کی صورت میں جیسے زیادہ ادائیگی کو ضروری سمجھا جاتا ہے تو تفریط زر (Deflation) کی صورت میں ادائیگی میں کمی بھی ہونی چاہئے' حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

البتہ جہاں کسی کرنسی کی قیمت اس حد تک گر جائے کہ کساد میں داخل ہو جائے جیسا کہ بیروت میں ہوا ہے تو اس کا حکم مختلف ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور علماء کے لئے قابل غور ہے' اور وہ یہ کہ زر کی قیمت میں کمی بعض اوقات اس طرح ہوتی ہے کہ خود حکومت اپنے سکے کی قیمت گرا دیتی ہے جسے Devaluation کہتے ہیں۔ اس صورت میں یہ پہلو غور طلب ہے کہ کیا اس صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب حکومت نے پہلے سکے کو باطل کر کے ایک نیا سکہ جاری کیا ہے جس کی قیمت پہلے سکے سے کم ہے؟ اگر سکے کی قیمت میں حکومت کی طرف سے کمی کرنے کی یہ تشریح کی جا سکتی ہو تو اس وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرض کی ادائیگی سابق سکے کی قیمت کے برابر نئے سکے میں کی جائے۔ مثلاً کسی نے سو روپے اس وقت قرض لئے تھے جب سو روپے چار ڈالر کے برابر تھے' بعد میں حکومت نے روپے کی قیمت گرا کر اسے تین ڈالر کے برابر کر دیا۔ گویا ایک ایسا نیا سکہ جاری کیا جو پہلے سکے کے مقابلے میں ۲۴ فیصد کم ہے' لہذا اب

اس نئے سکے کے ذریعہ قرض کی ادائیگی کی جائے تو ۱۳۳ روپے دیئے جائیں۔ یہ مسئلہ اہل علم کے لئے قابل غور ہے' لیکن اس کا فیصلہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ حکومت کی طرف سے روپے کی قیمت گرانے کا براہ راست اثر صرف بیرونی کرنسی کی شرح تبادلہ پر پڑتا ہے' اندرونی معاملات پر اس کا اثر بالواسطہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حقیقتاً نیا سکہ جاری نہیں کیا جاتا' بلکہ پرانے سکوں یا نوٹوں ہی کی قیمت میں تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ نوٹ کی جو کچھ بھی قیمت ہے وہ اعتباری ہے' حقیقی نہیں' اس لئے حکومت کے اعلان سے معنوی طور پر وہ نوٹ بدل جاتا ہے۔

بنکاری

(Banking)

بنک کی تعریف

"بینک" ایک ایسے تجارتی ادارے کا نام ہے جو لوگوں کی رقمیں اپنے پاس جمع کر کے تاجروں، صنعکاروں اور دیگر ضرورت مند افراد کو قرض فراہم کرتا ہے۔ آج کل روایتی بینک ان قرضوں پر سود وصول کرتے ہیں، اور اپنے امانت داروں کو کم شرح پر سود دیتے ہیں، اور سود کا درمیانی فرق بینکوں کا نفع ہوتا ہے۔

بنک کی تاریخ

نظام زر کے ارتقاء پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ لوگ اپنا سونا صرّافوں کے پاس بطور امانت رکھ دیتے تھے اور سنار اس کی رسید لکھ دیتے تھے، پھر رفتہ رفتہ ان رسیدوں سے ہی معاملات شروع ہوگئے۔ لوگ سونا واپس لینے کے لئے کم آتے تھے، تو یہ صورتحال دیکھ کر صرّافوں نے سونا قرض دینا شروع کر دیا۔ پھر جب یہ دیکھا کہ لوگ عموماً رسیدوں سے ہی معاملات کرتے ہیں تو صرّافوں نے بھی قرض خواہوں کو سونے کی بجائے رسیدیں دینی شروع کر دیں۔ اس طرح بنک کی صورت پیدا ہوئی بعد میں اسی کو ایک منظم ادارے کی شکل دیدی گئی۔

بنک کا قیام

بنک بھی بنیادی طور پر "جوائنٹ اسٹاک کمپنی" ہے۔ اس کے قیام کا طریقہ وہی ہے جو کمپنی کے قیام کا ہوتا ہے۔

بنک لوگوں کو اپنی امانتیں جمع کرانے کی دعوت دیتا ہے۔ (جو فقہی طور پر قرض ہی ہوتا ہے) ان کو اردو میں "امانتیں" عربی میں "ودائع" اور انگریزی میں (Deposits) کہتے ہیں۔ ڈپازٹ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱)—— (Current Account) ۔ (کرنٹ اکاؤنٹ) اس کو عربی میں "الحساب

الجاری" اور اردو میں "مدرواں" کہتے ہیں۔ اس میں رکھی ہوئی رقم پر سود نہیں ملتا ہے۔ اس اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم کسی وقت بھی، جتنی مقدار میں چاہیں بغیر کسی پابندی کے نکلوائی جا سکتی ہے۔

(۲) ـــ (Saving Account) ۔ جس کو عربی میں "حساب التوفیر" اور اردو میں "بچت کھاتہ" کہتے ہیں۔ اس میں رقم نکلوانے پر عموماً مختلف پابندیاں ہوتی ہیں، اس پر بنک سود دیتا ہے۔

(۳) ـــ (Fixed Deposit) جس کو عربی میں "ودائع ثابتہ" کہتے ہیں۔ اس میں مقررہ مدت سے پہلے رقم واپس نہیں لی جا سکتی۔ اس میں بھی بنک سود دیتا ہے اور سود کی شرح مدت کے مطابق ہوتی ہے۔ طویل مدت میں شرح زیادہ ہوتی ہے اور کم مدت پر شرح کم ہوتی ہے۔

جب ان تین قسم کے ڈپازٹ سے بنک کے پاس سرمایہ جمع ہو جاتا ہے اور کچھ بنک کا ابتدائی سرمایہ بھی ہوتا ہے تو اس تمام سرمائے کو استعمال کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس سرمائے کا ایک مقررہ حصہ سیال شکل میں اسٹیٹ بنک کے پاس جمع کرانا ضروری ہوتا ہے مرکزی بنک میں یہ سرمایہ عموماً ایسے سرکاری تمسکات کی شکل میں رہتا ہے جو بآسانی نقد میں تبدیل کئے جا سکیں اور ان پر کچھ سود بھی ملتا رہے۔ مرکزی بنک یہ طے کرتا ہے کہ تجارتی بنک اپنی امانتوں کا کتنے فیصد حصہ مرکزی بنک میں رکھیں گے۔ حالات کے لحاظ سے یہ تناسب بدلتا رہتا ہے۔ آجکل امانتوں کا تقریباً چالیس فی صد حصہ اسٹیٹ بنک میں رکھوانا پڑتا ہے۔ اسٹیٹ بنک تمام بنکوں کو اس بات کا پابند بناتا ہے۔ اس لئے کہ بنک میں بے شمار افراد کی رقمیں ہوتی ہیں۔ اسٹیٹ بنک کے فرائض میں داخل ہے کہ ڈپازیٹر کے مفادات کا تحفظ کرے۔ سیال سرمائے سے مراد وہ سرمایہ جو نقد ہو یا جلدی نقد پذیر ہو۔ اس کو عربی میں "السیولۃ" انگریزی میں (Liquidity) اور اردو میں "نقد پذیری" کہتے ہیں اس میں کیش، دوسرے بنک میں اکاؤنٹس اور ایسی دستاویزات شامل ہیں جو بسہولت نقد میں تبدیل ہو سکتی ہوں جیسے سرکاری تمسکات وغیرہ۔ پھر بنک کچھ سیال سرمایہ اپنے پاس بھی رکھتا ہے، تاکہ ڈپازیٹر کے مطالبات پورے کر سکے۔

بنک کے وظائف۔

بنک سرمایہ جمع کرنے کے بعد کئی وظائف ادا کرتا ہے۔ مثلاً تمویل، تخلیق زر، بر آمد، در آمد میں واسطہ بننا وغیرہ۔ یہاں ان وظائف کی قدرے وضاحت کی جاتی ہے۔

تمویل (Financing)

بنک کا سب سے اہم کام لوگوں کو ان کی ضروریات، خصوصاً تجارتی ضروریات کے لئے قرضے فراہم کرنا ہے۔ بنک کبھی طویل المیعاد قرضے جاری کرتا ہے، ایسے قرضوں کو عربی میں "ائتمان طویل الاجل" اور انگریزی میں (Long Term Credit) کہتے ہیں۔ اور کبھی قصیر المیعاد قرضے جاری کرتا ہے جو عموماً تین ماہ یا چھ ماہ تک کے لئے ہوتے ہیں۔ ان کو عربی میں "ائتمان قصیر الاجل" اور انگریزی میں (Short Term Credit) کہتے ہیں۔

بنک سے لوگ تین طرح کے قرضے لیتے ہیں۔ (۱) روز مرہ کی تجارتی ضروریات کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ مثلاً بلوں کی ادائیگی یا تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ ان کو Over Head Expenses کہتے ہیں۔ (۲) کاروبار کے رواں اخراجات مثلاً سامان تجارت کی خریداری اور خام مال وغیرہ خریدنے کے لئے قرضے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان کو عربی میں "راس المال العامل" اور انگریزی میں (Working Capital) کہتے ہیں۔ (۳) بڑے بڑے منصوبوں کے لئے جو قرض لئے جائیں انکو عربی میں "تمویل المشاریع" اور انگریزی میں (Project Financing) کہتے ہیں۔

قرض دینے کا طریق کار

بنکوں کو قرضے دینے کا غیر محدود اختیار نہیں ہوتا کہ جہاں چاہیں اور جتنی مقدار میں چاہیں قرض فراہم کریں، بلکہ مرکزی بنک کی طرف سے ایک حد مقرر ہوتی ہے، اس کے پابند رہتے ہوئے بنک قرضے فراہم کر سکتے ہیں، اس حد کو عربی میں "سقف الاعتماد" اور انگریزی میں -------(Credit Ceiling) کہتے ہیں۔ مثلاً آج کل مرکزی بنک کی طرف سے جو ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ بنک اپنی تمام امانتوں کا چالیس فیصد(% ۴۰) تو مرکزی بنک کے پاس رکھواتا ہے، جس کو عربی میں "احتیاطی السیولۃ" اور انگریزی میں (Liquidity Reserve) کہتے ہیں۔ اور پانچ فیصد بنک اپنے پاس نقد(Cash) کی شکل میں رکھتا ہے۔ اور تیس فیصد(% ۳۰) کی حد تک پرائیویٹ افراد یا اداروں کو قرض فراہم کر سکتا ہے۔ باقی پچیس فیصد(% ۲۵) سے یا تو سرکاری تمسکات خریدے یا سرکاری اداروں کو قرضہ فراہم کرے، جیسے پی آئی اے، واپڈا، اسٹیل ملز وغیرہ۔

"سقف الاعتماد" مقرر کرنے میں کئی عوامل کا دخل ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی کسی خاص شعبے مثلاً زراعت یا صنعت وغیرہ میں زیادہ تمویل مطلوب ہوتی ہے تو بنکوں کا رخ ادھر کر دیا جاتا ہے۔ کبھی افراط زر کو کنٹرول کرنے کے لئے حد مقرر کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ

بنکوں کے زیادہ قرضے جاری کرنے سے بھی افراط زر میں اضافہ ہوتا ہے ' جیسا کہ آگے "تخلیق زر" کے عنوان کے تحت اس کی وضاحت ہوگی۔ اور کبھی مروّجہ ٹیکسوں سے حکومت کے اخراجات پورے نہیں ہورہے ہوتے اور مزید ٹیکس لگانا مشکل ہوتا ہے تو مرکزی بنک کا(Reserve) بڑھاکر اور بنکوں کو سرکاری تمسکات خریدنے کا پابند کرکے عوام کی رقوم کا ایک بڑا حصہ حکومت قرض لے لیتی ہے۔

"سقف الاعتماد" کے اندر رہتے ہوئے بنکوں کے قرض دینے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے بنک یہ جائزہ لیتا ہے کہ جو شخص قرض لینا چاہتا ہے ' وہ مدت مقررہ پر قرض واپس بھی کردے گا یا نہیں؟ اس کی جائیدادیں اور مملوکات کیا ہیں؟ جائزہ لینے کے بعد بنک ایک حد مقرر کردیتا ہے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا قرض دینے کے لئے تیار ہیں ' جو حسب ضرورت وقتاً فوقتاً لیا جاسکے گا۔ قرض کی حد مقرر کرنے کو عربی میں "تحدید السقف" اور انگریزی میں (Sanction Of The Limit) کہتے ہیں۔ اس تحدید کے بعد اس شخص کے لئے بنک میں اکاؤنٹ کھولدیا جاتا ہے۔ اس اکاؤنٹ سے جب چاہے اور جتنا چاہے قرض لے سکتا ہے۔ اس اکاؤنٹ کھولنے پر بہت خفیف شرح سے بنک سود بھی لیتا ہے (مثلاً %۰۵ یا %۱) اور جب وہ قرض لے لیتا ہے تو اب باقاعدہ شرح سے سود لیا جاتا ہے۔ اس مدت کے دوران عموماً یوں ہوتا ہے کہ ایک رقم بنک سے لے کر اس میں سے جو بچ جائے وہ دوبارہ بنک میں واپس کردی جاتی ہے۔ اس طرح رقم لینے اور واپس کرنے کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ مدت کے اختتام پر بنک حساب کرتا ہے کہ کتنی رقم کتنے دن اس کے پاس رہی۔ اس حساب کے مطابق اس سے سود لیا جاتا ہے۔

بنک کی اقسام (باعتبار تمویل)

بنک کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض بنک خاص شعبوں میں تمویل کرتے ہیں اور بعض عمومی تمویل کرتے ہیں۔ اس طرح بنکوں کی اقسام یہ ہیں۔

(۱)--- زرعی بنک۔ جس کو عربی میں "المصرف الزراعی" اور انگریزی میں (Agri-cultural Bank) کہتے ہیں۔ یہ بنک زراعت کے شعبے میں قرض فراہم کرتا ہے۔

(۲)--- صنعتی بنک۔ جس کو عربی میں "المصرف الصناعی" اور انگریزی میں (Indus-trial Bank) کہتے ہیں۔ اس کا کام صنعتی ترقی کے لئے قرضے فراہم کرنا ہے۔

(۳) ترقیاتی بنک :۔ جو بنک کسی بھی شعبے میں ترقیاتی کاموں کے لئے قرضے دیتے ہیں ان کو "ترقیاتی بنک" کہتے ہیں۔ جن کو عربی میں "بنوک التنمیۃ" اور انگریزی میں (Develop-ment Banks) کہتے ہیں۔

(۴)--- کوآپریٹو بنک۔(Cooperative Bank) اس کو عربی میں "المصرف التعاونی" کہہ سکتے ہیں۔ یہ بنک امداد باہمی کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اس کا دائرہ کار ممبران تک محدود ہوتا ہے۔ جو لوگ اس کے ممبر ہوتے ہیں' انہی کے ڈپازٹ ہوتے ہیں اور انہی کو قرض دیا جاتا ہے۔

(۵)--- انوسٹمنٹ بنک۔(Investment Bank) عربی میں "بنک الاستثمار" کہتے ہیں۔ بظاہر مختلف ممالک میں یہ اصطلاح مختلف مفہوم کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے۔ ہمارے ہاں اس سے مراد ایسا بنک ہوتا ہے جس میں ڈپازٹ متعینہ مدت کے لئے ہوتے ہیں۔ عام کرنٹ اکاؤنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ اس میں نہیں ہوتے' صرف فکسڈ ڈپازٹ ہوتے ہیں۔ اور قرضے بھی محدود مدت کے لئے جاری کئے جاتے ہیں اس سے کم مدت کے لئے قرضے نہیں دیئے جاتے۔

ان تمام بنکوں کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔

(۶) کمرشل بنک :۔ ایسے بنک جو عمومی تمویل کا کام کرتے ہیں' کسی شعبے کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے ان کو "کمرشل بنک" (Commercial Bank) اور عربی میں "البنک التجاری" کہتے ہیں۔

درآمد' برآمد میں بنک کا کردار

بنک کے وظائف میں یہ بھی داخل ہے کہ بنک بین الاقوامی تجارت (درآمد و برآمد) میں ایک لازمی ذریعہ ہے۔ بنک کی وکالت اور معرفت کے بغیر برآمد اور درآمد ممکن نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے ملک سے کوئی چیز درآمد کرنا چاہتا ہے تو دوسرے ملک کا تاجر اس بات کا اطمینان چاہتا ہے کہ جب میں مطلوبہ سامان خریدار کو بھیجوں گا تو وہ واقعتاً قیمت کی ادائیگی کر دے گا۔ لہٰذا درآمد کنندہ برآمد کنندہ کو اعتماد دلانے کے لئے بنک سے ایک ضمانت نامہ حاصل کرتا ہے' جس میں بنک بیچنے والے کو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ یہ چیز فلاں شخص کو فروخت کر دی جائے تو ادائیگی کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ اسکو عربی میں "خطاب الضمان" یا "خطاب الاعتماد" کہتے ہیں۔ اور انگریزی میں (Letter Of Credit) کہتے ہیں۔ آسانی کیلئے ایل سی (L\C) کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ ضمانت نامہ حاصل کرنے کو اردو میں ایل۔ سی کھلوانا اور عربی میں "فتح الاعتماد" کہتے ہیں۔ بنک ایل۔ سی کھول کر برآمد کنندہ کے بنک کو بھیج دیتا ہے۔ برآمد کنندہ کے بنک کو Negotiating Bank کہتے ہیں۔ ایل۔ سی پہنچنے کے بعد وہاں سے مال جہاز میں بک کرادیا جاتا ہے۔ اور جہاز راں کمپنی مال بک ہونے کی رسید جاری کرتی ہے'

اس رسید کو عربی میں "بولیصۃ الشحن" اور انگریزی میں Bill Of Lading کہتے ہیں۔ بر آمد کنندہ کا بنک یہ بل آف لیڈنگ بمعہ متعلقہ کاغذات کے ایل۔سی کھولنے والے بنک کو بھیجتا ہے۔ در آمد کنندہ اپنے بنک سے یہ کاغذ وصول کر کے ایل۔سی سے اس کی مطابقت کرتا ہے۔ان کاغذات میں مال کی جو تفصیل لکھی گئی ہے وہ آرڈر کے خلاف ہو تو کاغذات واپس کر دیئے جاتے ہیں۔اگر کاغذات کی تفصیل ایل۔سی کے موافق ہو تو یہ کاغذات دکھا کر بندرگاہ سے مال وصول کیا جاتا ہے۔اور بنک عموماً یہ کاغذات در آمد کنندہ کو اس وقت دیتا ہے جب وہ قیمت کی ادائیگی کر دے۔——ادائیگی کے لئے بھی بنک اور در آمد کنندہ کے درمیان مختلف معاہدے ہوتے ہیں۔کبھی در آمد کنندہ ایل سی کھلواتے وقت ہی پوری رقم کی ادائیگی کر دیتا ہے۔اس صورت کو اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ فل مارجن (Full Margin) پر ایل سی کھلوائی گئی ہے، عربی میں اسکو فتح الاعتماد بغطاء کامل " کہتے ہیں، کبھی ساری ادائیگی بنک سے کاغذات چھڑوانے کے وقت ہوتی ہے اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ " زیرو مارجن " پر ایل سی کھلوائی گئی۔کبھی ایل سی کھولنے کے وقت تھوڑی ادائیگی کی جاتی ہے۔اس صورت میں کل رقم کا جتنا فیصد ادا کیا گیا اتنے ہی فیصد مارجن پر ایل سی کھولنا کہتے ہیں۔مثلاً کل قیمت کا پچیس فیصد حصہ ایل سی کھلواتے وقت بینک میں جمع کرا دیا گیا تو کہا جائے گا کہ یہ ایل سی پچیس فیصد مارجن پر کھلوائی گئی ہے۔
کبھی یہ معاہدہ بھی ہوتا ہے کہ کاغذات آنے پر بنک اپنے پاس سے ادائیگی کر دے گا اور در آمد کنندہ ایک معین مدت کے بعد ادائیگی کرے گا۔اس صورت میں بنک کا قرض در آمد کنندہ کے ذمے ہو جاتا ہے جس پر عموماً وہ سود لیتا ہے۔

ایل۔سی پر فیس

بنک کو ایل۔سی کھولنے میں جو خدمات ادا کرنی پڑتی ہیں، ان پر بنک معاوضہ لیتا ہے۔در آمد کنندہ کے بنک کی تین خدمات ہوتی ہیں۔

(۱)—— وکالت (Agency) یعنی بینک در آمد کنندہ کا وکیل بن کر بر آمد کنندہ سے معاملات کرتا ہے، خریدار کے کاغذات بر آمد کنندہ کو بھیجتا ہے، اور بر آمد کنندہ کے بھیجے ہوئے کاغذات وغیرہ در آمد کنندہ کو سپرد کرتا ہے۔ان خدمات پر بینک اجرت لیتا ہے۔

(۲)—— ضمانت (Guarantee) یعنی اس بات کی ضمانت لیتا ہے کہ اگر خریدار نے رقم ادا نہ کی تو وہ رقم ادا کرے گا۔اس پر بھی اجرت لیتا ہے۔

(۳)—— قرض (Credit) یعنی جب تاجر قیمت کی ادائیگی فوراً نہ کرے، اور بنک اس کی طرف سے ادائیگی کر دے تو یہ رقم در آمد کنندہ کے ذمے اس کا قرض ہو جاتی ہے۔جس پر وہ در آمد کنندہ سے سود وصول کرتا ہے۔

قرضہ دو نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ کبھی تو باقاعدہ قرضہ لیا جاتا ہے جب کہ یہ معاہدہ ہو کہ بروقت ادائیگی بنک کرے گا اور درآمد کنندہ اس کے کچھ عرصہ بعد بنک کو ادائیگی کرے گا۔ یہ ایک الگ معاہدہ ہوتا ہے' ایل۔سی کی فیس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' اس پر الگ سے باقاعدہ شرح سے سود لیا جاتا ہے۔ کبھی باقاعدہ تو قرض نہیں لیا جاتا' لیکن خود بخود معاملات کے درمیان میں بنک کا ایل۔سی کھلوانے والے کے ذمے قرض ہو جاتا ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ کبھی ایل۔سی کھلواتے وقت پوری ادائیگی ہو جاتی ہے۔ اس کو ۱۰۰ فیصد شرح (Margin) پر ایل۔سی کھلوانا کہتے ہیں۔ کبھی کچھ ادائیگی ہوتی ہے مثلاً ۲۵٪ فیصد کی ادائیگی پر ایل۔سی کھولی گئی اس کو ۲۵٪ فیصد شرح (Margin) پر ایل۔سی کھلوانا کہیں گے۔ کبھی ایل۔سی کھلوانے کے وقت بالکل ادائیگی نہیں ہوتی اس کو زیرو مارجن پر ایل۔سی کھولنا کہتے ہیں۔ اب اس صورت میں جب کہ ادائیگی کے بغیر یا کچھ ادائیگی پر ایل۔سی کھولی گئی ہو کاغذات آتے ہی بنک ادائیگی کر دے گا' بشرطیکہ سامان کے کاغذات ایل سی کی شرائط کے مطابق ہوں اور کوئی عدم مخالفت نہ پائی گئی ہو' مگر درآمد کنندہ کی طرف سے کسی وجہ سے ادائیگی میں چند دن تاخیر ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس لئے تاخیر ہو گئی کہ بنک کی طرف سے رابطہ کرنے میں تاخیر ہو گئی۔ ایسی صورت میں اتنے دن کا قرضہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ اس قرضے پر بھی سود لیا جاتا ہے۔

دوسری طرف برآمد کنندہ کا بنک ضمانت کسی چیز کی نہیں دیتا۔ یہاں بنک کے دو ہی کام ہوتے ہیں' جن پر بنک معاوضہ لیتا ہے۔

(۱) ــــــ وکالت

(۲) ــــــ قرض

یہاں قرض اس طرح ہوتا ہے کہ ایل۔سی میں کبھی تو معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ کاغذات آتے ہی ادائیگی ضروری ہوگی' اس کو (L.C at Sight) کہتے ہیں اس صورت میں برآمد کنندہ کے بنک کو کوئی قرض نہیں دینا پڑتا۔ کبھی معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ کاغذات پہنچنے کے اتنے دن بعد خریدار کی طرف سے ادائیگی ہوگی تو ایسی صورت میں اگر برآمد کنندہ کا بنک برآمد کنندہ تاجر کو فوراً ادائیگی کر دے تو یہ بنک کا برآمد کنندہ کے ذمے قرض ہو جائے گا۔

درآمد کنندہ کے پاس کبھی درآمد کے لئے رقم نہیں ہوتی یا رقم تو ہوتی ہے' مگر وہ اس رقم کو درآمد پر لگا کر منجمد نہیں کرنا چاہتا' تو وہ بنک سے قرض لے کر درآمد کرتا ہے۔ درآمد کے لئے بنک جو قرض دیتا ہے اس کو میں "تمویل الواردات" اور انگریزی میں (Import Financing) کہتے ہیں۔ ایسے ہی برآمد کے لئے بھی بنک سے قرض لیا جاتا

ہے، یعنی کسی تاجر کے پاس باہر کے کسی ملک سے اشیاء کی خریداری کا آرڈر ہوتا ہے، لیکن وہ اشیاء تیار یا مہیا کرنے کے لئے اسے رقم کی ضرورت ہوتی ہے جو وہ بینک سے قرض لیتا ہے اور قرض لیکر مطلوبہ اشیاء فراہم کرکے برآمد کرتا ہے اس صورت میں بینک برآمد کنندہ کو جو قرض دیتا ہے اس کو "تمویل الصادرات" اور انگریزی میں (Export Financing) کہتے ہیں۔

ہر حکومت برآمدات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے تاکہ ملک کا سامان باہر فروخت ہو تو اس سے زر مبادلہ ملک میں آئے۔ پاکستان میں بھی برآمدت کی حوصلہ افزائی کے لئے "اسٹیٹ بینک آف پاکستان" نے ایک اسکیم جاری کی ہے، جس کو (Export Refinancing) (اعادۂ تمویل الصادرات) کہتے ہیں۔ اس کا طریق کار پہلے یہ تھا کہ مرکزی بینک نے ملک کے کمرشل بینکوں کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ برآمدات کے لئے دیئے جانے والے قرضوں پر سود کم شرح سے وصول کیا کریں، مثلاً عام شرح سود ۱۵ فیصد ہوتی ہے تو برآمداتی قرضوں پر آٹھ فیصد سود لیا کریں۔ اس طرح جو کمرشل بینک قرض دے گا۔ مرکزی بینک اتنی ہی رقم اس بینک کو دیدیگا۔ اور آٹھ فیصد سود میں سے پانچ فیصد مرکزی بینک لے گا اور تین فیصد سود کمرشل بینک کا ہوگا۔ اس صورت میں بینکوں کو یہ فائدہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنی رقم لگائے بغیر تین فیصد سود مل جاتا تھا۔ کیونکہ قرض کی رقم مرکزی بینک نے مہیا کی تھی۔

اب اس کے طریق کار میں یہ تبدیلی ہوگئی ہے کہ مرکزی بینک کمرشل بینک کو اتنی رقم دینے کی بجائے اس بینک کے نام اتنی رقم کا ڈپازٹ اکاؤنٹ کھولدیتا ہے اور اس پر ٹریژری بل[1] کے حساب سے اس کمرشل بینک کو سود دیتا ہے، جو عموماً چودہ یا پندرہ فیصد ہوتا ہے۔ اور کمرشل بینک کو جو آٹھ فیصد سود قرضہ لینے والے کی طرف سے ملے گا اس میں سے پانچ فیصد مرکزی بینک کو دے گا۔ اس صورت میں کمرشل بینک کو تین فیصد سود اس میں سے بچے گا اور چودہ یا پندرہ فیصد سود مرکزی بینک کی طرف سے ملے گا۔ اس کا مقصد برآمدات میں تمویل کی حوصلہ افزائی ہے۔

بل آف ایکسچینج

بل آف ایکسچینج ایک خاص قسم کی دستاویز ہے۔ جب کوئی تاجر اپنا مال فروخت

---

[1] اس کی وضاحت مرکزی بینک کے وظائف کے بیان میں ہوگی۔ اس پر نیلام کے ذریعے سود ملے ہوتا ہے۔

کرتا ہے تو خریدار کے نام بل بناتا ہے بعض اوقات اس بل کی ادائیگی کسی آئندہ تاریخ میں واجب ہوتی ہے ۔ اس بل کو دستاویزی شکل دینے کے لئے مدیون اس کو منظور کر کے اس پر دستخط کر دیتا ہے کہ میرے ذمے فلاں تاریخ کو اس بل کی ادائیگی واجب ہے ۔ اس کو عربی میں "کمبیالۃ" اردو میں "ہنڈی" اور انگریزی میں (Bill of Exchange) کہتے ہیں ۔ بل آف ایکسچینج میں ادائیگی کی جو تاریخ لکھی ہوئی ہوتی ہے ' اس تاریخ کے آجانے کو عربی میں "نضج الکمبیالۃ" اور انگریزی میں (Maturity) کہتے ہیں ۔ اس تاریخ ادائیگی کو (Maturity date) کہتے ہیں ۔ ہنڈی میں لکھا ہوا دین تو مدیون سے تاریخ ادائیگی آنے پر ہی لیا جا سکتا ہے ۔ مگر دائن کو فوری طور پر رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی تیسرے شخص کو وہ بل دے کر لکھی ہوئی رقم لے لیتا ہے اور بل کی پشت پر دستخط کر کے اس کے حقوق اس تیسرے شخص کی طرف نقل کر دیتا ہے ۔ تیسرا شخص اس پر لکھی ہوئی رقم میں کٹوتی بھی کرتا ہے ۔ مثلاً ہنڈی پر ایک ہزار روپے لکھے ہوئے ہیں تو وہ نو سو پچاس ۹۵۰ روپے دیتا ہے ' اس عمل کو عربی میں "خصم الکمبیالۃ" اور انگریزی میں (Discounting of the Bill of Exchange) اور اردو میں "بٹہ لگانا" کہتے ہیں اور ہنڈی کی پشت پر جو دستخط کئے جاتے ہیں اسکو عربی میں "تظہیر" اور انگریزی میں (Endorsement) کہتے ہیں ۔ اور اردو میں "عبارت ظہری لکھنا" کہتے ہیں ہنڈی پر بٹہ لگانے کی شرح (Maturity) (نضج الکمبیالہ) کو مد نظر رکھ کر طے ہوتی ہے ۔ تاریخ ادائیگی جتنی قریب ہوتی جائے بٹہ لگانے کی شرح کم ہوتی جاتی ہے ۔

بنک بھی عموماً بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ کرتے ہیں اور یہ بھی بنکوں کے قصیر المیعاد قرضوں میں داخل ہے ۔ اس لئے کہ بل آف ایکسچینج کی ادائیگی (Maturity) عموماً تین ماہ میں ہوتی ہے ۔

تخلیق زر کا عمل

بنک کا ایک اہم کردار جس کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بنک پہلے سے موجود زر میں اضافہ کر کے زر کے پھیلاؤ کو بڑھاتا ہے اور زر کی رسد میں اضافے کا کام انجام دیتا ہے ' اس کو "تخلیق زر" یا "تخلیق اعتبار" کہتے ہیں ۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے ۔

لوگوں کے پاس جو رقم آتی ہے اس میں سے بہت تھوڑا سا حصہ لوگ اپنے پاس رکھتے ہیں ' اس کا زیادہ حصہ بنک میں رکھتے ہیں ۔ اسی طرح جب لوگ بنک سے قرض لیتے

ہیں تو نقد کی شکل میں لینا ضروری نہیں سمجھتے ہیں' بلکہ قرض دینے کی عموماً صورت یہ ہوتی ہے کہ بنک قرض لینے والے کا اکاؤنٹ کھول کر اس کو چیک بک دیدیتا ہے' تاکہ بوقت ضرورت چیک جاری کر کے بذریعہ چیک ادائیگی کر سکے۔ مثلاً کسی نے بنک سے ایک لاکھ روپے کا قرضہ لیا تو بنک اس کو نقد ایک لاکھ روپے دینے کی بجائے ایک لاکھ روپے کا اس کے نام اکاؤنٹ کھول کر چیک بک اس کو دیدیتا ہے۔ اب اس کو جب بھی کہیں کسی رقم کی ادائیگی کرنا ہو گی تو وہ چیک جاری کر کے ادائیگی کرے گا۔ ان دو باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ بنک کے پاس جتنے نوٹ موجود ہوتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب کسی بنک کے پاس کچھ نوٹ آئے تو بنک مرکزی بنک کا ریزرو نکال کر باقی رقم لوگوں کو قرض دیدے گا۔ جس نے قرض لیا وہ یا تو نقد لے گا ہی نہیں' بلکہ اکاؤنٹ کھلوا کر چیک بک لے گا یا لے کر دوبارہ اسی بنک میں رکھوائے گا۔ اس سے جتنی رقم کا مزید اکاؤنٹ کھولا گیا زر میں اتنا اضافہ ہوا' حالانکہ نوٹ اتنے ہی ہیں جتنے رکھے گئے تھے' پھر قرضدار کا اکاؤنٹ کھولنے سے جو نیا ڈپازٹ بنک کے پاس آیا ہے اس میں سے بھی ریزرو نکال کر باقی رقم بینک آگے قرض دیدے گا۔ جو شخص قرض لے گا وہ پھر بنک میں رکھوائے گا تو اس سے زر میں مزید اضافہ ہو گا' اسی طرح زر میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ اس کو "تخلیق زر" کہتے ہیں۔

مثلاً کسی بنک میں کسی شخص نے ۱۰۰ روپے رکھے۔ بنک نے اس میں سے بیس فیصد یعنی بیس روپے مرکزی بنک کو دے کر باقی اسی روپے کسی کو قرض دیدیئے۔ اس نے یہ اسی روپے پھر اسی بنک میں رکھ دیئے۔ تو اب بنک کے پاس کل ایک سو اسی روپے کے ڈپازٹ ہو گئے۔ اس کا بیس فیصد یعنی چھتیس روپے (جس میں سے بیس روپے پہلے دے چکا ہے' اس لئے مزید سولہ روپے) مرکزی بنک کو دے کر باقی ۶۴ روپے پھر کسی کو قرض دے گا اور وہ بھی اسی بنک میں رکھوائے گا تو بنک کے ڈپازٹ میں ۶۴ روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور بنک کے پاس ۲۴۴ روپے کے ڈپازٹ ہو جائیں گے۔ اس رقم کا بیس فیصد یعنی ۴۸.۸۰ روپے (جس میں سے چھتیس روپے پہلے دے چکا ہے' مزید ۱۲.۸۰ روپے) مرکزی بنک کو دے کر باقی ۵۱.۲۰ روپے کا پھر قرض دے گا اور وہ شخص دوبارہ اسی بنک میں رکھ دے گا۔ اس طرح اب بنک کے پاس ۲۹۵.۲۰ روپے کے ڈپازٹ ہو گئے۔ اس طرح بنک مزید قرض دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ رقم ختم ہو جاتی ہے۔ اس مثال میں بنک کے پاس سو روپے تھے' مگر اس سے فائدہ ۲۹۵ روپے کا حاصل کیا جا رہا ہے' ہر ڈپازٹ ہولڈر اپنے اپنے ڈپازٹ کی بنیاد پر چیک جاری کر سکتا ہے۔ تو گویا ۲۹۵ روپے کے چیک جاری ہو سکتے ہیں' جب کہ اصل میں سو روپے تھے مزید ۱۹۵ روپے

بنک کے تخلیق کردہ ہیں اور بنک کا یہ عمل "تخلیق زر" ہے۔ اس مثال میں ایک بنک قرض کر کے یہ کہا گیا ہے کہ قرض لینے والا اسی بنک میں دوبارہ رقم رکھوائے گا۔ لیکن عملاً یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس بنک کے بجائے کسی اور بنک میں رقم رکھوا دے، اس کے نتیجے میں اس دوسرے بنک کے ڈپازٹ بڑھ جائیں گے۔ بہرکیف! بنک سے لئے جانے والے ہر قرض کے نتیجے میں کسی نہ کسی بنک کے ڈپازٹ میں اضافہ ہوگا۔ تو اس صورت میں تمام بنکوں کا مجموعہ تخلیق زر کا عمل کرے گا۔

بنک کے زر کو بڑھانے میں ایک اور چیز کا بہت زیادہ دخل ہے، جس کو اصطلاح میں "فلوٹ" (Float) کہتے ہیں۔ بنک کے پاس جو رقم ڈپازٹ کے طور پر ہے، اس پر بنک کو سود دینا پڑتا ہے۔ یہ سود ان ڈپازٹس کی لاگت (Cost) ہے یعنی یہ سود دیکر بنک کو یہ ڈپازٹ حاصل ہوئے۔ لیکن کبھی رقم کچھ مدت کے لئے رہتی تو بنک کے پاس ہی ہے، مگر اس مدت میں وہ بنک کے ڈپازٹ میں شامل نہیں ہوتی اور اس پر بنک کو سود نہیں ادا کرنا پڑتا۔ یہ بنک کا ایسا زر ہے جس پر لاگت کچھ بھی نہیں ادا کرنی پڑتی۔ ایسا کئی صورتوں میں ہوتا ہے، مثلاً بنک کی طرف سے دوسرے بنک کی طرف چیک جاری کیا گیا تو اس بنک سے دوسرے بنک کی طرف رقم منتقل ہونے میں کچھ مدت لگ جاتی ہے۔ اس دوران یہ رقم بنک کا فلوٹ ہے۔ اسی کی ایک صورت یہ ہے کہ بنک نے کسی کو ڈرافٹ دیدیا، جب تک وہ ڈرافٹ کیش نہیں کرالیا جاتا اس وقت تک یہ رقم بنک کے پاس فلوٹ کے طور پر ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ بنک ایل۔ سی کھولتا ہے اور ایل۔ سی کھلوانے والا ادائیگی اسی وقت کر دیتا ہے، مگر بنک آگے ادائیگی اس وقت کرتا ہے جب کہ کاغذات آجاتے ہیں، اتنی دیر کے لئے بغیر کسی لاگت کے وہ رقم بنک کے پاس رہتی ہے، اسی طرح ریلوے بلٹی میں ہوتا ہے کہ کاغذات بنک میں آتے ہیں۔ بنک میں ادائیگی کر کے کاغذات وصول ہوتے ہیں اور کاغذات وصول کر کے بلٹی چھڑائی جاتی ہے۔ اب کاغذات بنک سے لیتے ہوئے ادائیگی تو بنک میں کر دی جاتی ہے، مگر بلٹی بھیجنے والے کو یہ رقم ملنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ یہ بھی بنک کا فلوٹ ہے۔ حج درخواستوں کا معاملہ بھی ایسے ہی ہے۔ اس کے علاوہ فلوٹ کی اور بھی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ فلوٹ کے ذریعے بنکوں کو کافی سرمایہ حاصل ہوتا ہے۔

اس سے ایک اور بات سامنے آگئی۔ وہ یہ کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنک ڈپازیٹر (رقم رکھوانے والوں) کو جو سود دیتا ہے، بنک کی لاگت بھی اتنی ہی ہوتی ہوگی۔ مثلاً ۸ فیصد سود دیتا ہے تو بنک کی لاگت بھی آٹھ فیصد ہوگی، مگر واقعہ میں معاملہ ایسا نہیں، بنک کی حقیقی لاگت اس سے کم ہوتی ہے جو اس نے سود دیا ہے۔ اس لئے کہ بنک کے پاس بہت سی رقم

ایسی بھی ہوتی ہے جس پر وہ سود ادا نہیں کرتا اور اس سے نفع حاصل کرتا ہے۔ایسی رقم ایک تو فلوٹ کی رقم ہے، دوسری کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم ہوتی ہے ------- اس سے معلوم ہوا کہ بنک کو جو نفع حاصل ہوتا ہے، اس کا آٹھ فیصد سے بھی کم حصہ عوام کو ملتا ہے، لہٰذا بنک کے نفع کا رخ عوام کی طرف کم ہے اور سرمایہ داروں کی طرف زیادہ ہے۔

مرکزی بنک

البنک الرئیسی (Central Bank)

یہ ملک کا انتہائی اہم ادارہ ہوتا ہے، جو تمام تجارتی بنکوں (Commercial Banks) کا نگران ہوتا ہے، ملک کے مالیاتی نظام میں اس کا بہت اہم کردار ہوتا ہے، جیسا کہ اس کے وظائف کی تفصیل سے معلوم ہوگا۔اس ادارے کو اردو میں "مرکزی بنک" عربی میں "البنک الرئیسی" یا "المصرف الرئیسی" اور انگریزی میں (Central Bank) کہتے ہیں۔ مرکزی بنک مختلف ممالک میں مختلف ناموں سے موسوم ہوتا ہے مثلاً پاکستان میں "اسٹیٹ بنک آف پاکستان" مرکزی بنک ہے۔ انگلینڈ میں "بنک آف انگلینڈ" انڈیا میں "ریزرو بنک آف انڈیا" مرکزی بنک ہے۔

مرکزی بنک کے وظائف (Functions)

مرکزی بنک (Central Bank) متعدد وظائف انجام دیتا ہے۔جن کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱)---- یہ حکومت کا بنک ہوتا ہے۔ حکومت کی رقمیں اس میں رکھی جاتی ہیں۔مگر حکومت کی رقموں پر یہ بنک حکومت کو سود نہیں دیتا ہے۔اور بوقت ضرورت حکومت کو قرضہ بھی دیتا ہے اور اس سے معمولی شرح پر سود بھی لیتا ہے۔

۲)---- مرکزی بنک حکومت کا معاشی پالیسیوں میں مشیر بھی ہوتا ہے۔

(۳)---- مرکزی بنک زر مبادلہ کو محفوظ رکھتا ہے، اس کو ذخیرہ کرتا ہے اور بوقت ضرورت اس کا اجراء بھی کرتا ہے۔

۴)---- مرکزی بنک کے سب سے اہم کردار دو ہیں۔ایک یہ کہ تمام تجارتی بنکوں (Commercial Banks) کی نگرانی کرتا ہے اور ان کا نظم وضبط برقرار رکھتا ہے تاکہ ان سے مالیاتی فوائد حاصل ہوں اور نقصانات کے پہلو کا سد باب ہو۔

اس مقصد کے لئے مرکزی بنک مختلف کام کرتا ہے۔ مثلاً (ا) کسی بنک کے قائم ہونے سے پہلے اس کو لائسنس دینا مرکزی بنک کا کام ہے۔مرکزی بنک کی طرف سے

لائسنس کے بغیر بنک قائم نہیں ہو سکتا۔ اور لائسنس جاری کرنے سے پہلے مرکزی بنک تمام ضروری باتوں کا جائزہ لیتا ہے۔ (۲) معاشی نقطۂ نظر سے جہاں رقم لگانے کی ضرورت زیادہ ہو، مرکزی بنک تجارتی بنکوں کا رخ اس طرف کر دیتا ہے۔ مثلاً کسی خاص علاقے میں ترقیاتی کاموں کی ضرورت ہے۔ یا کسی خاص شعبے (مثلاً زراعت یا تجارت یا صنعت وغیرہ) میں سرمایہ لگانے کی ضرورت ہو تو مرکزی بنک تجارتی بنکوں کو ان علاقوں یا شعبوں میں زیادہ قرضے دینے کا پابند کر دیتا ہے۔ (۳) جن لوگوں (Depositers) نے بنک میں اپنی رقمیں لگائی ہوئی ہیں ان کی رقموں کے تحفظ کے لئے قواعد و ضوابط بناتا ہے۔ مثلاً رقم کا اتنا حصہ مرکزی بنک میں رکھنا ہو گا اور اتنا حصہ بنک اپنے پاس محفوظ رکھے گا وغیرہ۔ (۴) اس بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ بنک کی مجموعی حالت مالی طور پر مستحکم ہو اور ان میں اپنے ذمے حقوق کی ادائیگی کی صلاحیت اور استعداد رہے۔ (۵) تجارتی بنکوں کے باہمی لین دین کا تصفیہ بھی مرکزی بنک کرتا ہے، اس مقصد کے لئے مرکزی بنک میں ایک شعبہ ہوتا ہے جس کو عربی میں "غرفة المقاصة" اور انگریزی میں (Clearing House) کہتے ہیں۔ اردو میں اس کو "تصفیہ گھر" کہہ سکتے ہیں۔ تجارتی بنکوں کے درمیان جو لین دین ہوتا ہے، ایک دوسرے کی طرف چیک یا ڈرافٹ جاری ہوتے ہیں، روزانہ "غرفة المقاصة" میں ان کا حساب کر لیا جاتا ہے۔ (۶) کمرشل (تجارتی) بنکوں کو بوقت ضرورت مرکزی بنک قرضہ بھی دیتا ہے۔ جب کسی بنک سے رقمیں نکلوانے کے لئے اتنے زیادہ مطالبات آجائیں کہ وہ اپنے سیال اثاثوں سے ان کو پورا نہ کر سکے تو بنکوں کے پاس آخری چارۂ کار یہی ہوتا ہے کہ وہ مرکزی بنک سے قرض لیں، اسی لئے مرکزی بنک کو "آخری چارۂ کار کے طور پر قرض دینے والا" (Lender of the last Resort) کہتے ہیں۔

۵)۔۔۔۔۔ مرکزی بنک کی دو اہم ذمہ داریوں میں سے دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ یہ بنک ملک میں زر کے بہاؤ کو کنٹرول کرتا ہے۔ اگر ملک میں افراط زر زیادہ ہو تو ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جس سے زر سکڑنا شروع ہو جائے اور اگر تفریط زر کی صورت حال ہو تو ایسے کام کرے جس سے زر کا پھیلاؤ بڑھے۔ زر کو پھیلانے یا سکڑنے کے لئے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔

(۱) مرکزی بنک تجارتی بنکوں کو جس شرح سود پر قرضہ دیتا ہے اس کو (Bank Rate) (بنک ریٹ) اور عربی میں "سعر البنک" کہتے ہیں اسی کو (Offi-cial Rate) اور عربی میں "السعر الرسمی" بھی کہتے ہیں۔ یہ "بنک ریٹ" بھی زر کے بہاؤ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب مرکزی بنک شرح سود (بنک ریٹ) زیادہ کرے گا تو اب تجارتی بنکوں کو زیادہ سود پر قرضہ ملے گا، لہٰذا وہ خود بھی عوام کو زیادہ سود پر

قرضہ دیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ قرضہ کم لیں گے۔ جب لوگ قرضہ کم لیں گے تو بنک کا تخلیق زر کا عمل کم ہوگا اور زر کی گردش بھی کم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس مرکزی بنک شرح سود کو گھٹائے گا تو تجارتی بنک بھی گھٹا دیں گے جس کے نتیجے میں لوگ قرض زیادہ لیں گے اور تخلیق زر کا عمل زیادہ ہو کر زر کی رسد بڑھے گی۔

ٹریژری بل:

(۲) دوسرے طریقے کو (Open Market Operation) اور عربی میں "عملیات السوق المفتوحة" کہتے ہیں۔ اس نظام کو سمجھنے سے پہلے ٹریژری بل کو سمجھنا ضروری ہے۔ حکومت کو جب رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو رقم حاصل کرنے کے لئے حکومت مختلف قرضے کی دستاویزات جاری کرتی ہے جن کو "سرکاری تمسکات" کہتے ہیں، ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ تجارتی بنکوں سے رقم وصول کرنے کے لئے "مرکزی بنک" ایک بل جاری کرتا ہے، جس کو انگریزی میں (Treasury Bill) (ٹریژری بل) اور عربی میں "سندات الخزينة" کہتے ہیں۔ ایک بل کی "قيمة اسمية" (لکھی ہوئی قیمت) (Face Value) سو روپے ہوتی ہے۔

یہ بل مقررہ مدت کے لئے جاری ہوتے ہیں۔ عموماً چھ ماہ کے لئے جاری ہوتے ہیں۔ یہ بل بذریعہ نیلام بیچے جاتے ہیں اور ان کے ابتدائی خریدار صرف تجارتی بنک ہی ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی بنکوں سے خرید لیتے ہیں۔ نیلام کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مرکزی بنک اعلان کر دیتا ہے کہ اتنی رقم (مثلاً دس ارب روپے) کے ٹریژری بل جاری کئے جا رہے ہیں اور بنک اپنی اپنی طلب بتاتے ہیں۔ ہر بنک بتاتا ہے کہ میں اتنی قیمت پر اتنے بل خریدنا چاہتا ہوں، آجکل اس کا ریٹ عموماً ۱۲ یا ۱۴ فیصد ہے۔ یعنی سو روپے کا بل عموماً ۸۶ یا ۸۷ روپے میں فروخت ہوتا ہے۔ جس جس بنک کی بولی قبول ہوتی جاتی ہے اس کو اس کی طلب کے مطابق بل دے کر رقم اس سے وصول کر لی جاتی ہے۔ اب جس بنک نے یہ بل مثلاً ۸۶ روپے میں خریدا، وہ چھ ماہ کے بعد اس کے پورے سو روپے وصول کرلے گا اور چودہ روپے اس کے سود یا نفع کے ہوں گے۔ اس بل کی مدت آنے سے پہلے اسٹیٹ بنک ہی میں یا بازار حصص (Stock Exchange) میں اس بل کی ہنڈی کی طرح ڈسکاؤنٹنگ (بھنگانا) بھی ہو سکتی ہے۔

"اوپن مارکیٹ آپریشن" کا مطلب یہ ہے کہ زر کے بہاؤ کو کنٹرول کرنے کے لئے مرکزی بنک تجارتی بنکوں پر کسی قسم کی پابندی لگانے کی بجائے خود ٹریژری بل کی خرید یا فروخت کے لئے کھلے بازار میں آکر زر کی رسد اور اس کے بہاؤ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب زر کا پھیلاؤ کم کرنا ہو تو مرکزی بنک ٹریژری بل کم قیمت پر فروخت کرنے

کی آمادگی ظاہر کرتا ہے، جس کے نتیجے میں تجارتی بنک اپنا سرمایہ دے کر بل خریدنے لگتے ہیں اور بنکوں کا زر مرکزی بنک میں واپس ہونا شروع ہو جاتا ہے بنکوں کے پاس سرمایہ کم ہو جاتا ہے اور قرضوں کی فراہمی کم ہو کر تخلیق زر کا عمل بھی کم ہو جاتا ہے، اسکے برعکس اگر زر کا پھیلاؤ بڑھانا ہو تو مرکزی بنک ٹریژری بل زیادہ قیمت پر خریدنے کے لئے کھلے بازار میں آجاتا ہے، لوگ بل بیچ کر مرکزی بنک سے رقم لیتے ہیں تو زر پھیل جاتا ہے۔

(۳) مرکزی بنک ریزرو کی شرح کم یا زیادہ کر کے بھی زر کی رسد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ریزرو کم ہو گا تو بنکوں کو زیادہ قرضہ فراہم کرنے کا موقعہ ملتا ہے اور تخلیق زر کا عمل بڑھتا ہے۔ ریزرو زیادہ ہو تو بنک کم قرضہ فراہم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں تخلیق زر کا عمل بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس لئے مرکزی بنک زر کو پھیلانے کے لئے ریزرو کم کر دیتا ہے اور زر کے پھیلاؤ کو کم کرنے کے لئے ریزرو بڑھا دیتا ہے۔

(۴) سود کی شرح کم یا زیادہ کر کے بھی زر کے بہاؤ کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ مرکزی بنک تجارتی بنکوں کو شرح سود بڑھانے کا پابند کر دے گا تو لوگ قرضہ کم لیں گے اور زر کا بہاؤ کم ہو گا، اور اگر شرح سود گھٹانے کا پابند کرے گا تو لوگ قرضہ زیادہ لیں گے اور زر کا بہاؤ بڑھے گا۔

(۵) قرضہ جاری کرنے کی حد بندی کر کے یا مختلف شعبوں کے کوٹے مقرر کر کے بھی زر کے بہاؤ کو کم کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ پابندی لگا دے کہ بنک اپنی امانتوں کے صرف چالیس فیصد کی حد تک قرضہ دے سکیں گے یا بنک اپنی امانتوں کا ۲۵ فیصد فلاں شعبے میں قرضہ دیں گے۔ ان پابندیوں سے بنک کم قرضہ جاری کر سکیں گے اور تخلیق زر میں کمی ہو گی۔

(۶) مرکزی بنک نوٹ چھاپ کر بھی زر کے بہاؤ پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

۶)۔۔۔ مرکزی بنک کے وظائف میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ بنکوں کے لئے قرضہ دینے کا ایسا نظام مقرر کرتا ہے، جس سے لوگوں کا بھی نقصان نہ ہو اور ملکی معاشی نظام میں یا بنک کی اپنی مالی حالت میں عدم استحکام پیدا نہ ہو۔

۷)۔۔۔ اب مرکزی بنک کو بنکوں کے علاوہ دوسرے مالیاتی اداروں (جن کی وضاحت آگے آرہی ہے) کی نگرانی کا اختیار بھی دیدیا گیا ہے۔

دیگر مالیاتی ادارے

المؤسسات المالیۃ (غیر المصرفیۃ)

(Non- Banking Financial Institutions)

(N.B.F.I)

کچھ ادارے اتنی بات میں تو بنک کی طرح ہوتے ہیں کہ لوگوں سے رقمیں جمع کر کے ان کے ذریعے تمویل کرتے ہیں، مگر بنک کے دوسرے وظائف انجام نہیں دیتے۔ مثلاً ان میں بنک کی طرح کرنٹ اکاؤنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ نہیں ہوتے، صرف فکسڈ ڈپازٹ ہوتے ہیں، یہ ادارے بنکوں کی طرح بین الاقوامی تجارت میں بھی واسطہ نہیں بنتے۔ ایسے اداروں کو عربی میں "المؤسسات المالیۃ (غیر المصرفیۃ)" اور انگریزی میں (Non- Banking Financial Institutions) (نان بنکنگ فنانشل انسٹیٹیوشن) کہتے ہیں۔ ایسے مالیاتی اداروں کی کئی قسمیں ہیں، جن کی وضاحت یہاں کی جاتی ہے۔

۱) ترقیاتی تمویلی ادارے

(Development Financial Institution)

جس کو (D.F.I) کہتے ہیں۔

یہ وہ ادارے ہیں جو ملک میں مختلف ترقیاتی منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ ابتداءً یہ ادارے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی طرف سے قائم ہوئے تھے۔ وہ امداد ان اداروں میں بھیجتے تھے اور یہ ادارے ترقیاتی منصوبوں میں تمویل کرتے تھے۔ اسٹیٹ بنک بھی بعض مقاصد کے لئے ان کو سرمایہ دیتا ہے، اس قسم کے کئی ادارے ہمارے ملک میں ہیں۔ مثلاً (N.D.F.C) (نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن)، (I.D.B.P) (انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بنک آف پاکستان)، (P.I.C.I.C) (پاکستان انڈسٹریل اینڈ کریڈٹ انویسٹمنٹ کارپوریشن)، بینکرز ایکویٹی، پاک سعودیہ، پاک کویت، پاک لیبیا وغیرہ۔

۲)----- (A.D.B.P) ایگریکلچر ڈیولپمنٹ بنک آف پاکستان۔ یہ شعبہ زراعت میں ترقی کے لئے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ عالمی ادارے اور اسٹیٹ بنک ان کو سرمایہ دیتا ہے اور یہ آگے تمویل کرتے ہیں۔

۳)---(Co-operative Society) (کوآپریٹو سوسائٹی) جن کو عربی میں "جمعیۃ تعاونیۃ" کہتے ہیں۔یہ ادارے امداد باہمی کے لئے قائم ہوتے ہیں۔جو لوگ ان کے ممبر بنتے ہیں، صرف انہی کو قرض دیتے ہیں۔

۴)---لیزنگ کمپنی۔یہ کمپنیاں اجارے کے طریقے پر سرمایہ فراہم کرتی ہیں جس کی تفصیل انشاء اللہ اگلے باب میں آئے گی۔پہلے لیزنگ کمپنیوں کو عوام سے سرمایہ لینے کی اجازت نہیں تھی، صرف (N.D.L.C) (نیشنل ڈیولپمنٹ لیزنگ کمپنی) کو اجازت تھی۔ اب تمام لیزنگ کمپنیوں کو عوام سے سرمایہ لینے کی اجازت دیدی گئی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ ایک مہینے سے زیادہ کے انوسٹمنٹ سرٹیفکیٹ جاری کئے جائیں۔

۵)---(N.I.T) (این، آئی، ٹی) نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ

متعدد ممالک میں "یونٹ ٹرسٹ" کا تصور موجود ہے۔وہ یہ کہ ایک فنڈ قائم کیا جاتا ہے۔جس میں لوگوں سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس فنڈ کی رقم سے خود براہ راست کاروبار کرنے کے بجائے رقم مختلف نفع بخش کاموں میں لگائی جاتی ہے۔ان سے مجموعی طور پر جو نفع ہو وہ لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔این، آئی، ٹی بھی ایک ادارہ ہے جو اسی قسم کے فنڈ کے انتظامی فرائض انجام دیتا ہے فنڈ کے یونٹ بنائے جاتے ہیں، یونٹ بیچ کر لوگوں سے رقم جمع کر کے اس سے سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔عموماً اس کی سرمایہ کاری شیئرز میں ہوتی ہے۔مختلف کمپنیوں کے شیئرز لے کر نفع حاصل کیا جاتا ہے۔کسی بھی کمپنی کے شیئرز جاری ہوں تو این، آئی، ٹی کو ترجیحی حق دیا گیا ہے کہ وہ بیس فیصد تک چاہے تو شیئرز لے سکتا ہے۔

۶)---(I.C.P) (انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان) یہ ادارہ کئی کام کرتا ہے۔ایک یہ کہ این، آئی، ٹی کی طرح ایک فنڈ جاری کرتا ہے۔جس کو "آئی، سی، پی میوچل فنڈ" کہتے ہیں۔لوگ اس فنڈ میں رقم لگاتے ہیں۔این، آئی، ٹی کی طرح اس رقم سے سرمایہ کاری کر کے نفع تقسیم کیا جاتا ہے۔این، آئی، ٹی اور آئی، سی، پی کے فنڈ میں فرق یہ ہوتا ہے کہ این، آئی، ٹی کا یونٹ خرید کر جب چاہیں این، آئی، ٹی کو ہی دوبارہ بیچا جا سکتا ہے مگر آئی، سی، پی کے شیئرز لے کر آئی، سی، پی کو دوبارہ نہیں بیچے جا سکتے ہیں، البتہ کمپنی کے شیئرز کی طرح کسی اور کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔

آئی، سی، پی کا دوسرا کام یہ ہے کہ جو لوگ بیرون ملک رہتے ہیں وہ آئی، سی، پی میں اپنی رقم کا اکاؤنٹ کھولتے ہیں۔ایک وہ اکاؤنٹ جس میں آئی، سی، پی کو اختیار ہوتا ہے کہ جو شیئرز چاہے خرید کر سرمایہ کاری کرے۔دوسرا وہ اکاؤنٹ جس میں آئی، سی، پی کو یہ اختیار نہیں ہوتا، بلکہ جس کا اکاؤنٹ ہے وہ خود بتاتا ہے کہ فلاں کمپنی کے

شیئرز لئے جائیں۔

آئی سی پی کا تیسرا کام یہ ہے کہ کسی کو زیادہ قرضے کی ضرورت ہو تو یہ ادارہ کئی بنکوں کو ملا کر مجموعی طور پر قرض کا انتظام کرتا ہے۔

سودی بنکاری کا متبادل نظام

گزشتہ اوراق میں بینکنگ کے مروّجہ نظام کی وضاحت کی گئی ہے' اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ موجودہ نظام کی بنیاد سود ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سود ختم کیا جائے تو بینکنگ کے نظام کو چلانے کا متبادل طریقہ کیا ہو؟ اس سلسلے میں اب تک جو تجاویز سامنے آئی ہیں' ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سودی بنکاری کے متبادل نظام پر گفتگو سے پہلے چند بنیادی باتیں ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

(۱)---- سودی بینکاری کا متبادل تلاش کرنے کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہئے کہ مروّجہ بنک جتنے کام جس انداز سے کر رہے ہیں' وہ سارے کام کم و بیش اسی انداز سے انجام دیئے جاتے رہیں' اور ان کے مقاصد میں کوئی فرق واقع نہ ہو' کیونکہ اگر سب کچھ وہی کرنا ہے جو اب تک ہوتا رہا ہے تو "متبادل طریق کار" کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بلکہ "متبادل" کا مطلب یہ ہے کہ بنک کے جو کام موجودہ تجارتی حالات میں ضروری یا مفید ہیں' ان کی انجام دہی کیلئے ایسا طریق کار اختیار کیا جائے جو شریعت کے اصولوں کے دائرے میں ہو' اور جس سے شریعت کے معاشی مقاصد پورے ہوں۔ اور جو کام شرعی اصولوں کے مطابق ضروری یا مفید نہیں ہیں' اور جنہیں شرعی اصولوں کے مطابق ڈھالا نہیں جا سکتا' ان سے صرفِ نظر کی جائے۔

(۲)---- چونکہ سود کی ممانعت کا اثر تقسیم دولت کے پورے نظام پر پڑتا ہے' اس لئے یہ توقع کرنا بھی غلط ہوگا کہ سود کے شرعی متبادل کو بر سر کار لانے سے تمام متعلقہ فریقوں کے نفع کا تناسب وہی رہے گا جو اس وقت سودی نظام میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلامی احکام کو ٹھیک ٹھیک روبکار لایا جائے تو اس تناسب میں بڑی بنیادی تبدیلیاں آ سکتی ہیں' بلکہ یہ تبدیلیاں ایک مثالی اسلامی معیشت کیلئے ناگزیر طور پر مطلوب ہیں۔

(۳)---- آج کل بنک جو خدمات انجام دیتا ہے' ان میں یہ پہلو مفید بلکہ موجودہ معاشی حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی منتشر انفرادی بچتوں کو یکجا کر کے انہیں صنعت و تجارت میں استعمال کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ بچتیں اگر ہر شخص کی اپنی تجوری میں پڑی رہتیں تو ان سے صنعت و تجارت کے فروغ میں کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ فاضل دولت کا ست پڑا رہنا نہ شرعی اعتبار سے مطلوب ہے نہ عقلی اور معاشی اعتبار سے اسے مفید کہا جا سکتا ہے۔

لیکن ان بچتوں کو صنعت و تجارت میں مصروف کرنے کے لئے جو راستہ مروّجہ بنکوں نے اختیار کیا ہے' وہ قرض کا راستہ ہے چنانچہ یہ ادارے سرمایہ داروں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کے مالی وسائل کو اپنے منافع کے لئے اس طرح استعمال کریں کہ ان وسائل سے پیدا ہونے والی دولت کا زیادہ حصہ خود ان کے پاس رہے' اور سرمایہ کے اصل مالکوں کو ابھرنے کا کماحقہ موقع نہ مل سکے۔

چنانچہ مروّجہ نظام بنکاری میں بنک کی حیثیت محض ایک ایسے ادارے کی ہے جو روپے کا لین دین کرتا ہے' اسے اس بات سے سروکار نہیں ہے کہ اس روپے سے جو کاروبار ہو رہا ہے' اس کا منافع کتنا ہے؟ اور اس سے کس کو فائدہ اور کس کو نقصان پہنچ رہا ہے؟

اسلامی احکام کی رو سے بنک ایسے ادارے کی حیثیت میں باقی نہیں رہ سکتا جس کا کام صرف روپے کا لین دین ہو۔ اس کے بجائے اسے ایک ایسا تجارتی ادارہ بنانا پڑیگا جو بہت سے لوگوں کی بچتوں کو اکٹھا کر کے ان کو براہ راست کاروبار میں لگائے' اور وہ سارے لوگ جن کی بچتیں اس نے جمع کی ہیں' براہ راست اس کاروبار میں حصہ دار بنیں' اور ان کا نفع و نقصان اس کاروبار کے نفع و نقصان سے وابستہ ہو جو ان کے سرمایہ سے بالآخر انجام دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا سودی بنکاری کے متبادل جو انتظام تجویز کیا جائیگا' اس پر یہ اعتراض نہ ہونا چاہئے کہ بنک نے اپنی سابقہ حیثیت ختم کر دی ہے' اور وہ بذات خود ایک تجارتی ادارہ بن گیا ہے' کیونکہ اس کے بغیر وہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی جس کی وجہ سے متبادل نظام کی تلاش کی جا رہی ہے۔

(۴)----چوتھی بات یہ ہے کہ صدیوں سے جمے اور بیٹھے ہوئے کسی نظام کو بدل کر اسکی جگہ ایک نیا نظام جاری کرنے میں ہمیشہ مشکلات ہوتی ہیں۔ لیکن اگر نظام کی تبدیلی ضروری ہو تو صرف ان مشکلات کی بناء پر نئے نظام کو ناقابل عمل قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ ایسے میں ان مشکلات کا حل تلاش کیا جاتا ہے' ان مشکلات کے خوف سے پیش قدمی نہیں روکی جاتی۔

بینکنگ کا شرعی طریق کار

اس تمہید کے اب وہ تجاویز پیش کی جاتی ہیں جو بینکنگ کو شرعی اصول کے مطابق

چلانے کے لئے پیش کی گئی ہیں۔ پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ بینکنگ کا تعلق دو طرفہ ہوتا ہے۔ ایک طرف اس کا تعلق ان لوگوں سے ہوتا ہے جنہوں نے اپنی رقمیں بنک میں رکھوائی ہیں۔ دوسری طرف ان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جن کو بنک تمویل کرتا ہے یعنی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ دونوں قسم کے تعلقات پر الگ الگ گفتگو کی جاتی ہے۔

بنک اور ڈپازیٹر کا تعلق

موجودہ نظام میں بنک میں جو رقمیں رکھوائی جاتی ہیں آجکل بینکنگ کی اصطلاح میں ان کو "امانت" کہا جاتا ہے لیکن فقہی اعتبار سے حقیقت میں وہ قرض ہوتا ہے۔ اگر بینک کو اسلامی طریقے سے چلایا جائے تو "امانت داروں" کے ساتھ بنک شرکت یا مضاربت کا معاملہ کریگا۔ اس طریقے میں وہ رقم قرض نہیں ہوگی، بلکہ اب صورتحال یہ ہوگی کہ رقم رکھوانے والے "رب المال" ہونگے اور بنک مضارب ہو گا اور لگایا ہوا سرمایہ "رأس المال" ہو گا جس پر بنک کسی خاص شرح سے نفع دینے کا پابند نہیں ہو گا۔ بلکہ جو کچھ نفع حاصل ہو گا وہ ایک طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم ہو گا۔

پھر "کرنٹ اکاؤنٹ" یا "الحساب الجاری" میں بنک آج بھی ڈپازیٹر کو کوئی سود نہیں دیتے۔ اسلامی طریق کار میں بھی اس مد پر کوئی منافع نہیں دیا جائے گا۔ اور کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم ڈپازیٹر کی طرف سے بنک کو دیا ہوا غیر سودی قرض سمجھا جائے گا۔ البتہ دوسرے نفع بخش کھاتے "مضاربت" یا "شرکت" کے کھاتوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

البتہ ان کھاتوں کو مضاربت یا شرکت سے بدلنے میں یہ عملی دشواری معلوم ہوتی ہے کہ شرکت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ تمام کھاتہ داروں کی رقم ایک ساتھ مشترک کھاتے میں آئے، اور ایک ہی وقت پر نفع و نقصان کا حساب کر کے تمام شرکاء میں نفع نقصان تقسیم کیا جائے۔ لیکن بنک میں یہ بات قابل عمل نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں لوگوں کے رقم رکھوانے اور نکالنے کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا ہے۔ فکسڈ ڈپازٹ میں اگرچہ نکلوانے کی مدت تو مقرر ہوتی ہے، لیکن رکھوانے کا وقت مقرر نہیں، ہر شخص ہر روز فکسڈ ڈپازٹ کا کھاتہ کھول سکتا ہے اور سیونگ اکاؤنٹ میں نہ نکلوانے کی تاریخ مقرر ہے، نہ رکھوانے کی۔

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ نظام تبدیل کیا جائے، اور لوگوں کو پابند کیا جائے کہ وہ ایک خاص تاریخ میں رقم جمع کرائیں، اور ایک خاص تاریخ ہی میں نکالیں۔ اور شرکت کی مدت سہ ماہی یا ماہانہ مقرر کرلی جائے، اور ہر مدت کے اختتام پر نفع و نقصان کا حساب کر کے اس کی تقسیم عمل میں آئے۔ لیکن اس صورت میں اوّل تو لوگوں کیلئے بنک میں رقم رکھوانے میں مشکلات پیش آئیں گی، ایک ہی تاریخ میں رکھوانے اور ایک ہی تاریخ

میں نکلوانے سے بینکوں پر پریشر بھی بڑھے گا' اور اس کے نتیجے میں بہت سی بچتیں کام میں لگنے سے رہ جائیں گی۔

لہذا بینکوں کی شرکت و مضاربت میں نفع کی تقسیم کا ایک اور طریق کار بعض حلقوں کی طرف سے تجویز کیا گیا ہے جس کو اکاؤنٹنگ کی اصطلاح میں "الحساب الیومی" یا روزانہ پیداوار پر مبنی حساب (Daily Product Basis) کہا جاتا ہے۔ اس تجویز کا حاصل یہ ہے کہ شرکاء کو یہ آزادی دی جائے کہ وہ جب چاہیں مخصوص قواعد کے مطابق بینک سے رقمیں نکالتے یا اس میں داخل کرتے رہیں' لیکن جب ایک مدت شرکت ختم ہو تو یہ دیکھا جائے کہ اس مدت میں کتنی رقم کتنے دن بینک میں رہی' اور فی روپیہ فی یوم منافع کا اوسط کیا رہا پھر جس شخص کے جتنے روپے اس مدت کے دوران جتنے دن بینک میں رہے' اس کے حساب سے نفع تقسیم کر دیا جائے۔

شرعی نقطۂ نظر سے اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ اس طریقے سے نفع کی تقسیم تقریبی ہوتی ہے۔ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کسی کے حقیقی نفع کا کچھ حصہ دوسرے کے پاس چلا جائے۔ مثلاً چھ ماہ کے بعد نفع تقسیم ہوا۔ ان چھ ماہ میں سے پہلے تین ماہ میں نفع زیادہ ہوا اور آخری تین ماہ میں نفع کم ہوا۔ ان چھ ماہ کے دوران زید کی رقم تو چھ ماہ بینک میں رہی اور عمرو کی رقم آخری تین ماہ رہی اور نفع فی یوم برابر ملے گا تو اس صورت میں زید کے حقیقی نفع کا کچھ حصہ عمرو کے پاس آجائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ نفع کی تقسیم کی مذکورہ صورت میں یہ اشکال موجود ہے' لیکن اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ شرکت میں شرکاء کے اموال مشاع طور پر مخلوط ہو جاتے ہیں۔ لہذا نفع تقسیم کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہر ایک کے سرمائے سے حقیقی نفع کیا ہوا' بلکہ تمام مجموعی سرمائے سے جو مجموعی نفع ہوا ہو وہ تقسیم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ احتمال موجود ہے کہ ایک کے سرمائے سے نفع حاصل ہوا ہو اور دوسرے کے سرمائے سے بالکل نفع نہ ہوا ہو۔ معلوم ہوا کہ نفع کی حقیقی تقسیم شرکت میں مطلوب نہیں' تقریبی تقسیم بھی کافی ہے بشرطیکہ تمام شرکاء اس پر راضی ہوں لہذا مروجہ طریقے سے نفع کی تقسیم کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے' خصوصاً جب کہ رقم رکھواتے ہوئے ہر شخص کو معلوم بھی ہوتا ہے کہ نفع اس تقریبی طریقے سے تقسیم ہوگا' تو باہمی رضامندی سے تقسیم نفع کے ایک حسابی طریقے کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہئے۔

یہ ساری تفصیل اس وقت ہے' جب کہ کوئی شخص مدت کے درمیان میں بینک میں داخل ہوتا ہے یا درمیان میں رقم نکلواتا اور رکھتا رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص درمیانِ مدت میں بینک سے بالکل ہی نکل رہا ہو تو اس صورت میں یہ مسائل نہیں ہونگے۔ اس صورت میں بہتر توجیہ یہ ہوگی کہ اب بینک اس کو نفع تقسیم نہیں کر رہا' بلکہ یہ شخص کاروبار میں اپنے

حصے کو بیچ رہا ہے اور بنک اس کو خرید رہا ہے۔ اور حصہ خریدنے کے لئے بنک نے نفع نقصان کی صورت حال کو دیکھ کر اس کے حصے کی قیمت طے کی ہے۔

اسلام کے طریقہ ہائے تمویل

اب تک اسلامی نظام میں بنک اور رقم رکھوانے والے کے تعلق پر گفتگو ہوئی ہے۔ اب بنک کے اہم کام تمویل یعنی سرمایہ فراہم کرنے کے اسلامی طریقوں پر گفتگو کی جاتی ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے اس کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔

شرکت و مضاربت

سود کا صحیح اسلامی متبادل شرکت اور مضاربت کا طریقہ ہے، جو سود سے بدرجہا اچھے نتائج کا حامل ہے۔ یہ تمویل کا نہایت مثالی عادلانہ، منصفانہ طریقہ ہے، جس کے تقسیم دولت پر بہت اچھے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے بینکنگ کا یہ تصور بھی ختم ہو سکتا ہے کہ بنک کاروبار کے عمل سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہوئے صرف سرمایہ فراہم کرنے کے لئے واسطہ بنتا ہے۔ شرکت اور مضاربت کا نظام جاری ہونے کی صورت میں بنک کا نام خواہ بنک ہی رہے، لیکن بنک کی یہ حیثیت ختم ہو جائے گی، اب بنک کا باقاعدہ کاروبار میں عمل دخل ہو گا۔

شرکت اور مضاربت میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ شرکت میں شرکاء سرمائے میں بھی حصہ دار ہوتے ہیں اور عمل میں بھی حصہ دار ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی عملاً کاروبار میں دخل نہ دے یہ الگ بات ہے۔ اور مضاربت میں رب المال کا سرمایہ ہوتا ہے اور مضارب عمل کرتا ہے رب المال کی عمل میں شرکت نہیں ہوتی۔

اب یہاں شرکت اور مضاربت کے چند بنیادی اصول بیان کئے جاتے ہیں شرکت اور مضاربت کا معاملہ کرتے ہوئے ان کی رعایت ضروری ہوگی۔

(۱)---- سرمائے کے تناسب سے نفع مقرر کرنا شرعاً جائز نہیں۔ نفع مقرر کرنے کا صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ جو نفع حقیقت میں ہو گا اس کا فیصد حصہ مقرر کیا جائے۔

(۲)---- نفع کا جو تناسب بھی چاہیں باہمی رضامندی سے طے کر سکتے ہیں مثلاً کسی کا سرمایہ چالیس فیصد ہو اور اس کے لئے ساٹھ فیصد نفع کی شرط لگائی جائے اور دوسرے کا سرمایہ ساٹھ فیصد ہو اور اس کے لئے چالیس فیصد نفع کی شرط لگائی جائے، یہ جائز ہے۔ نفع کی تقسیم بقدر سرمایہ ضروری نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مختلف شرکاء کے لئے نفع کی مختلف شرحیں طے کی جا سکتی ہیں، جس کو آج کل کی اصطلاح میں "وزن"

(Weightage) دینا کہتے ہیں۔ مختلف شرکاء کو مختلف وزن دیا جا سکتا ہے۔ البتہ جس شریک نے کام نہ کرنے کی شرط لگائی ہو، اسکا نفع اس کے سرمائے کے تناسب سے زائد نہیں ہو سکتا۔

(۲)۔۔۔۔ نفع میں تو مختلف شرکاء کو مختلف وزن دیا جا سکتا ہے، لیکن نقصان میں اس طرح کرنا جائز نہیں۔ نقصان بہرحال سرمایہ کے بقدر ہو گا۔ جس کو فقہاء یوں تعبیر فرماتے ہیں۔

"الربح علی ما اصطلحوا علیه و الوضیعة بقدر رأس المال"

شرکت و مضاربہ میں دشواریاں

شرکت اور مضاربہ کے جاری کرنے میں عموماً دو قسم کی دشواریاں بتائی جاتی ہیں۔

(۱)۔۔۔۔ ایک یہ کہ آج کل دیانت و امانت کا معیار بہت پست ہو گیا ہے، کسی کو شرکت پر سرمایہ دیا جائے تو وہ کبھی بھی حقیقی نفع نہیں بتاتا، بلکہ نفع کی بجائے نقصان دکھاتا ہے۔ اس لئے شرکت و مضاربت پر عمل مشکل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی معاشرے میں بددیانتی کی حالت افسوسناک ہے، لیکن بددیانتی کی وجہ سے کبھی کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ مختلف طریقوں سے بددیانتی کا سدباب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً آڈٹ کا نظام، اکاؤنٹس کا نظام، سینٹرل بنک کی نگرانی وغیرہ۔ مشارکہ اور مضاربہ میں بھی اس جیسی کارروائیاں کی جا سکتی ہیں، نیز جس شخص یا ادارے کے بارے میں ایک دفعہ بددیانتی ثابت ہو جائے اس کو تمام بنکوں میں "بلیک لسٹ" کیا جا سکتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ایسا شخص آئندہ کسی بنک سے سرمایہ حاصل کرنے سے محروم ہو جائیگا۔ اگر اس کو قانون بنا کر مؤثر طور پر نافذ کیا جائے تو لوگ بددیانتی کرتے ہوئے ڈریں گے، اور بڑی حد تک اس مفسدے کا سدباب ہو جائیگا اور بھی متعدد قانونی کارروائیاں ہو سکتی ہیں۔ ایک بنک تنہا اگر یہ کام کرے تو واقعی اس کے لئے مشکلات ہیں لیکن اگر حکومت کی سطح پر یہ کام کیا جائے اور تمام بنکوں کا نظام اسکے مطابق ہو تو بددیانتی کے سدباب کے طریقے ہو سکتے ہیں۔

(۲) دوسری دشواری انکم ٹیکس کے نظام کی وجہ سے ہے۔ عموماً تاجر دو قسم کے کھاتے بناتے ہیں۔ انکم ٹیکس کے لئے الگ کھاتے ہوتے ہیں اور واقعی کھاتے دوسرے ہوتے ہیں، اس صورت حال میں مشارکہ یا مضاربہ پر سرمایہ لینے والا حقیقی نفع دکھائے تو انکم ٹیکس والے پکڑ لیتے ہیں اور اگر وہ بنک کو حقیقی نفع نہ دکھائے تو نفع کی حقیقی تقسیم نہیں ہوتی، اس کا جواب یہ ہے کہ جب حکومتی سطح پر اس مسئلے پر غور کیا جائے تو مشارکہ اور مضاربہ کو

کامیاب بنانے کے لئے ٹیکس کے نظام کی اصلاح بھی ضروری ہوگی۔ ٹیکس کو آمدنی سے وابستہ کرنے کے بجائے ریاستی ضروریات کے لئے ٹیکس کا کوئی ایسا نظام جاری کیا جا سکتا ہے جس میں بددیانتی کا یہ دروازہ بند ہو جائے۔

پھر تمویل کی بہت سی مدات ایسی ہیں جہاں شرکت و مضاربت میں بہت لمبے چوڑے حساب و کتاب کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مثلاً برآمدات کی تمویل میں پہلے سے برآمد کئے جانے والے سامان کی لاگت اور حاصل ہونے والی متوقع قیمت کا علم ہوتا ہے' لہٰذا اس میں شرکت یا مضاربت کرنے میں دھوکہ فریب کا امکان بہت کم ہے۔

اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ بنک تاجر کے پورے کاروبار میں شریک ہو' وہ کاروبار کے کسی متعین حصے میں بھی شرکت کر سکتا ہے جس میں نفع کا تعین زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ چونکہ بنک کے لئے تاجروں کا ابدی اور دائمی شریک رہنا ضروری نہیں بلکہ تاجروں اور صنعتکاروں نے اپنی عمارت' مشینری وغیرہ پہلے ہی سے لگائی ہوئی ہے' اور بنک چھ ماہ یا سال بھر کیلئے ان سے شرکت کا معاملہ کر سکتا ہے' اس لئے یہ بات بھی باہمی رضامندی سے طے ہو سکتی ہے کہ اس مخصوص اور محدود شرکت میں کاروبار کے صرف براہ راست اخراجات (Direct Expenses) تسلیم کئے جائیں گے' اور اجمالی منافع (Gross Profit) فریقین کے درمیان تقسیم ہوگا۔ اور چونکہ جامد اثاثے تاجر نے فراہم کئے ہیں' اس لئے اس کے نفع کا تناسب بڑھایا جا سکتا ہے' لیکن ان جامد اثاثوں کے اخراجات اور بالواسطہ اخراجات شرکت پر نہ ڈالے جائیں۔ اس طرح حساب و کتاب میں بھی آسانی ہو جائے گی اور بددیانتی کا خطرہ بھی کم ہو جائیگا' اور ٹیکس چونکہ صافی منافع پر لگتا ہے' اس لئے ٹیکس کے مسئلے کا بھی حل نکل آئیگا۔ شرکت و مضاربت کو کس کس قسم کی تمویل میں استعمال کیا جا سکتا ہے' اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ آگے آئیگی۔

اصل اسلامی طریقہ تو مشارکہ اور مضاربہ ہی ہے' مگر بعض حالات میں مشارکہ اور مضاربہ ممکن نہیں ہوتا' مثلاً کسی کسان کو ٹریکٹر خریدنے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہو تو اس میں شرکت و مضاربہ ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں چند اور بھی تمویل کے طریقے ہیں' جو اب بیان کئے جاتے ہیں۔

اجارہ

یہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہے' جس کو (Leasing) کہا جاتا ہے۔ اور اس کی وضاحت پہلے (کمپنی کے لئے سرمائے کی فراہمی کے عنوان میں) ہو چکی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ محض اجارے کا لفظ دیکھ کر کسی معاملے کو شرعی نہیں قرار دیدینا چاہئے۔ اس لئے کہ آج کل عموماً اجارے کے جو معاملات ہوتے ہیں ان میں

اجارے کی حقیقت موجود نہیں۔ اجارے کی حقیقت یہ ہے کہ موجر (Lessor) جو مشینری وغیرہ اجارے پر دے رہا ہو وہ اسکا مالک اور ذمے دار ہو، مگر تمویلی اجارے میں آج کل عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ موجر (Lessor) اس مشینری کی کسی قسم کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے، اگر مشینری کا نقصان ہو جائے تو وہ مستاجر (Lessee) کا نقصان سمجھا جاتا ہے، حتیٰ کہ کسی حادثے میں مشینری تباہ ہوجائے تو بھی مستاجر کرایہ دیتا رہتا ہے۔ موجر کا تعلق اس مشینری سے صرف اتنا ہوتا ہے کہ عدم ادائیگی کی صورت میں وہ مشینری کو بیچ کر اپنا قرضہ وصول کرلیتا ہے۔ لہٰذا آج کل عموماً حقیقی اجارہ نہیں ہوتا اصل مقصد تو سود پر قرض دینا ہی ہوتا ہے، مگر ٹیکس میں بچت کرنے کے لئے اجارے کا نام دیدیا جاتا ہے۔ اس طرح کے معاملات شرعاً جائز نہیں۔ تاہم اگر واقعی موجر مشینری کا مالک ہو اور وہ اس کی ذمہ داری قبول کرکے اس کا اجارہ کرے تو اس کی گنجائش ہے۔ اور کرایہ مقرر کرتے ہوئے اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ مشینری کی قیمت بمعہ کچھ نفع کے وصول ہو جائے تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، مگر معاہدے میں یہ شرط نہ لگائی جائے کہ مدت اجارہ ختم ہونے پر مشینری خود بخود مستاجر کی ملکیت ہو جائیگی۔ اس لئے کہ اس میں "صفقة فی صفقة" کی شکل بن جاتی ہے۔ البتہ بغیر سابقہ شرط کے مدت ختم ہونے کے بعد اس کی طرف ملکیت منتقل کرنے کی گنجائش ہے۔

مرابحہ مؤجلہ

یہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہو سکتا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص بنک سے قرضہ لینے کے لئے آئے تو بنک اس سے پوچھے کہ کس چیز کو حاصل کرنے کے لئے رقم درکار ہے؟ بنک اس کو رقم دینے کے بجائے وہ چیز خرید کر مرابحۃً نفع پر ادھار بیچ دیتا ہے۔ نفع بطور مساومہ کے کوئی بھی قیمت طے کر کے لیا جا سکتا تھا، مگر نفع کی ایک شرح طے کر کے مرابحہ اس لئے کیا جاتا ہے، تاکہ نظام میں یکسانیت رہے اور تمام لوگوں سے نفع ایک شرح کے ساتھ وصول ہو۔ نفع کی جو شرح طے کی جاتی ہے، اس کو مارک اپ (Mark up) کہتے ہیں۔

یہ بھی تمویل کا ایک جائز طریقہ ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اسکو ٹھیک ٹھیک ضروری شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اس لئے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا باتفاق فقہاء جائز ہے۔ اسلامی بنکوں میں اس طریقے پر بڑی وسعت کے ساتھ عمل ہو رہا ہے، لیکن یہ انتہائی نازک طریقہ ہے اس میں ذرا سی بے احتیاطی اس کو سودی نظام سے ملا دیتی ہے۔ آج کل بنکوں میں مرابحہ کی حقیقت کو سمجھے بغیر اور اس کی ضروری شرائط کی رعایت کئے بغیر اس پر عمل ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

یہاں ان غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے' جو عموماً مرابحہ کا معاملہ کرتے ہوئے بنکوں سے ہو جاتی ہیں۔اور صحیح شرعی طریقے سے مرابحہ کرتے ہوئے ان سے بچنا ضروری ہے۔

مروجہ مرابحہ میں شرعی خامیاں

(۱) مرابحہ کی صحیح شکل تو یہ ہے کہ بنک کوئی چیز خرید کر نفع (Mark up) پر بیچ دے 'مگر پاکستانی بنکوں میں ایسا بھی ہو تا رہا ہے کہ جس چیز پر عقد مرابحہ کیا جا رہا ہے وہ چیز پہلے سے ہی اس شخص کے پاس موجود ہوتی تھی جو بنک سے قرض لینے کے لئے آیا ہے۔بنک اس سے اس چیز کو نقد کم قیمت پر خرید کر پھر نفع پر اسی کو دوبارہ ادھار بیچ دیتا ہے۔اس کو (Buy Back) (بائی بیک) کہتے ہیں۔اس طرح حقیقتاً مرابحہ کی بجائے نفع (Mark up) کو "بائی بیک" سے وابستہ کر دیا گیا۔جو شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز ہے 'کیونکہ ایک ہی شخص سے کم قیمت پر خرید کر فوراً ہی اسے زیادہ قیمت پر ادھار بیچ دینا در حقیقت سودی قرض ہی کی ایک شکل ہے جب کہ پہلی خریداری میں ہی یہ شرط ہوتی ہے کہ اسے دوبارہ بیچ دیا جائیگا۔

(۲) (Buy Back) کا حیلہ بھی حقیقت میں نہیں ہوتا' عموماً محض فرضی کارروائی ہوتی ہے۔ایسا کوئی سامان سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا جس پر بائی بیک کیا جا رہا ہو۔حتیٰ کہ اداروں کے ایسے اخراجات جن سے کوئی چیز خریدی نہیں جاتی مثلاً تنخواہیں 'بلوں کی ادائگی وغیرہ ان کے لئے بھی بنکوں سے مرابحۃً قرض مل جاتا ہے۔

(۳) اگر (Buy Back) نہ بھی ہو' حقیقت میں مرابحہ ہی ہو تو بھی اس بات کا اہتمام نہیں کیا جاتا کہ جس سامان کو مرابحۃً بیچا جا رہا ہے وہ پہلے بنک کے قبضے اور ضمان میں آئے' حالانکہ مرابحہ کے درست ہونے کے لئے اس سامان کا پہلے بنک کے قبضے اور ضمان میں آنا ضروری ہے۔

(۴) بنک کے پاس جب کوئی شخص سرمایہ حاصل کرنے کیلئے آتا ہے تو بنک تمویل کی حد مقرر (تحدید السقف) کر دیتا ہے کہ اتنے سرمائے کی حد تک بنک مرابحہ کرنے کے لئے تیار ہے۔معاہدے (Agreements) پر دستخط کرالئے جاتے ہیں۔اس وقت بنک اس شخص کو سامان خریدنے کا وکیل بھی بنا دیتا ہے۔لیکن اس وقت کوئی بیع منعقد نہیں ہوتی' بلکہ وہ محض ایک باہمی معاہدہ ہوتا ہے کہ بنک حسب ضرورت ان شرائط پر اپنے گاہک کو اس کی ضرورت کی اشیاء خرید کر فراہم کریگا۔اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جب گاہک کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بنک کو بتائے 'پھر بہتر طریقہ تو یہ ہوتا کہ بنک وہ چیز اپنے ذرائع سے خرید کر اپنے قبضے میں لاتا 'پھر گاہک کو مرابحۃً فروخت کرتا۔لیکن اگر بنک خود خریدنے کے بجائے اسی گاہک کو خریداری کا وکیل بنائے تو اس میں کم از کم یہ ضروری تھا کہ پہلے

گاہک وہ چیز بنک کے وکیل کی حیثیت سے خرید کر بنک کو مطلع کرے' پھر اس سے ایجاب و قبول کر کے اپنے لئے خریدے۔ یہاں گاہک کی دو حیثیتوں کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھنا ضروری تھا۔ پہلے اس کی حیثیت وکیل کی ہے اور جب تک وہ اس حیثیت میں ہے اس پر وکالت کے احکام جاری ہوں گے۔ اور جب تک سامان پر اس کا قبضہ بنک کے وکیل کی حیثیت میں ہے' اس وقت تک وہ سامان بنک کی ملکیت میں ہے اور اسی کے ضمان میں ہے' لہٰذا اگر اس دوران وہ سامان وکیل کی کسی تعدّی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو بنک کا نقصان ہونا چاہئے۔ پھر جب وہ بنک کو اطلاع دیکر اس سے وہ سامان اپنے لئے خریدے تو اس وقت سامان گاہک کی ملکیت اور ضمان میں آجائے گا' اور اگر اس کے بعد ہلاک ہو تو گاہک کا نقصان ہو گا۔

گاہک کی ان دو حیثیتوں کا کلی طور پر ایک دوسرے سے ممتاز ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن آجکل اکثر بنک اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے بلکہ تحدید السقف کے وقت یعنی Limit منظور کرتے ہوئے مرابحہ کے معاہدے پر جو دستخط ہوتے ہیں' انہی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد گاہک سامان خود خرید کر اسے اپنے استعمال میں لاتا رہتا ہے' اور بنک سے خریداری کیلئے کوئی الگ ایجاب و قبول نہیں کیا جاتا۔ جس کے نتیجے میں یہ محض ایک مصنوعی کارروائی ہو جاتی ہے۔ اور عملی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بنک نے گاہک کو رقم دی' اور ایک مدت کے بعد زیادہ رقم وصول کرلی۔ سامان کا بنک کے ضمان میں آنا' پھر اس کی ملکیت کا گاہک کی طرف منتقل ہونا' اور اسی مقصد کیلئے ایجاب و قبول وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ بالکل حرام اور ناجائز ہے۔

(۵) یہ غلطی بھی ہوتی ہے کہ تمویل کی حد مقرر کرنے (تحدید السقف) کے معاہدے پر دستخط ہوتے ہی بنک اس شخص سے Bill of Exchange (ہنڈی) یا پرامیسری نوٹ پر دستخط کرا لیتا ہے۔ یہ اس لئے غلط ہے کہ ہنڈی پر دستخط تو اس وقت ہوتے ہیں' جب کوئی شخص مدیون بن جاتا ہے۔ اور یہ شخص ابھی بنک کا مدیون نہیں بنا' ابھی تو آئندہ مرابحہ مؤجلہ کرنے پر آمادگی کا معاہدہ ہوا ہے۔ گاہک بنک کا مدیون اس وقت بنے گا جب وہ سامان بنک سے اپنے لئے خرید لے گا' لہٰذا پرامیسری نوٹ پر دستخط بھی اسی وقت ہونے چاہئیں۔

(۶) سودی نظام میں قرضہ کی ادائیگی کا وقت آجائے اور مقروض ابھی قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو یا ابھی ادا نہ کرنا چاہتا ہو تو اس قرض کی مدت بڑھا دی جاتی ہے۔ پہلا سود قرضے میں شامل ہو جاتا ہے اور اس پر مزید سود لگا کر مزید مہلت دیدی جاتی ہے۔ اس کو (Roll Over) (رول اور) کرنا کہتے ہیں۔ مرابحہ میں بھی یہی سلسلہ شروع

کر دیا گیا۔ مرابحہ کی ثمن کی ادئیگی کا وقت آنے پر ادائیگی کی استطاعت نہ ہو تو یہاں بھی قرض کو رول اوور کر دیتے ہیں' حالانکہ یہ تو ایک بیع تھی' اس میں سامان کی ایک قیمت طے تھی اس قیمت میں اب اضافہ یا کمی ممکن نہیں' نہ اس مرابحہ پر مزید مرابحہ کیا جا سکتا ہے۔ مرابحہ کی حقیقت اور شرائط کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے اس جیسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں' جن کی وجہ سے معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں رہتا۔ اس لئے مرابحہ پر عمل کرنے کے لئے اس کی شرائط کی رعایت بہت ضروری ہے۔

اب مرابحہ مؤجلہ سے متعلق چند مسائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

دین کا وثیقہ

مرابحہ مؤجلہ میں سامان کا ثمن خریدار کے ذمے دین ہو جاتا ہے' لہٰذا بنک دین کے وثیقے کے طور پر کفالت یا رہن کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ رہن کی مختلف صورتیں آج کل رائج ہیں' ان کے شرعی احکام پر تفصیلی بحث میرے عربی رسالہ "احکام البیع بالتقسیط" میں موجود ہے۔ یہاں اس کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

ثمن کی توثیق کے لئے مختلف صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔

(۱) مبیع کو ہی بطور وثیقے کے اپنے پاس رکھ لیا جائے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ استیفاء ثمن کے لئے حبسِ مبیع کے طور پر مبیع کو اپنے پاس رکھنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ بیع مؤجل (ادھار بیع) میں بائع کو حبسِ مبیع کا حق نہیں ہوتا[۱] البتہ بطور رہن کے مبیع کو اپنے پاس رکھا جا سکتا ہے' بشرطیکہ خریدار مبیع پر قبضہ کرنے کے بعد پھر رہن رکھے۔[۲] حبسِ مبیع اور رہن میں فرق یہ ہے کہ حبسِ مبیع کی صورت میں مبیع مضمون بالثمن ہو گا اور اسکے ہلاک ہو جانے سے بیع فسخ ہو جائے گی اور رہن کی صورت میں وہ سامان مضمون بالقیمۃ ہو گا اور اس کے ہلاک ہونے سے بیع فسخ نہیں ہوگی۔

(۲) آج کل رہن کی ایک صورت رائج ہے جس کو "الرھن الساذج" (Simple Mortgage) یا "الذمۃ السائلۃ" (Floating Charge) کہتے ہیں۔ جسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ رہن راہن کے قبضے میں ہی رہتا ہے وہ اسکو استعمال بھی کرتا رہتا ہے' مرتہن رہن پر قبضہ نہیں کرتا' البتہ مرتہن کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ بروقت دین کی ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اس کو بیچ کر دین وصول کر سکتا ہے۔ اور راہن دین ادا کرنے سے پہلے رہن کو

---

[۱] الهندیه ج ۳ : ص ۱۵ - کتاب البیوع، الباب الرابع

[۲] ردالمحتار مع الدرالمختار ج ۶ : ص ۴۹۷ کتاب الرهن

خود تو استعمال کرتا رہتا ہے مگر اسکی ملکیت کسی اور کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔

اس رہن میں اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں مرہون شے کا قبضہ مرتہن کی طرف منتقل نہیں ہوتا جب کہ ظاہر یہ ہے کہ مرتہن کا قبضہ رہن کی صحت کیلئے ضروری ہے لیکن بعض وجوہ کی بناء پر (جن کی تفصیل مذکورہ رسالے میں موجود ہے) رہن کی یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے۔

(۳) دین کی توثیق کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی تیسرے شخص کو ضامن بنالیا جائے، جس کو فقہی اصطلاح میں "کفالہ" کہا جاتا ہے۔ یہ صورت بھی جائز ہے اور اس کے تفصیلی احکام فقہاء نے لکھے ہیں، لیکن اس پر اجرت یا فیس لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ

سودی نظام میں تو ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں خود بخود سود بڑھتا رہتا ہے، جس کے ڈر سے مدیون دین بروقت ادا کر دیتا ہے، مگر مشارکہ، مضاربہ یا مرابحہ میں یہ صورت نہیں ہوتی، اسلئے لوگ غلط فائدہ اٹھا کر ادائیگی میں تاخیر کرتے ہیں۔ اس کے سدّباب کا کیا طریقہ ہو؟ یہ مسئلہ علمائے معاصرین میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ ادائیگی میں تاخیر مدیون کے اعسار (نادار ہونے) کی وجہ سے ہو تو اس کا حکم قرآن پاک نے بیان کر دیا ہے۔

"وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ"

یعنی مدیون کو کسی قسم کے اضافے کے بغیر مزید مہلت دینی چاہئے، لیکن اگر وہ مماطل ہو، یعنی سرمایہ پاس ہونے کے باوجود بلا وجہ تاخیر کر رہا ہو تو اس کا سدّباب کیسے ہو؟

اس سلسلے میں بعض علمائے معاصرین نے مدیون پر تاخیر کی صورت میں تعویض مالی (Compensation) عائد کرنے کو جائز قرار دے دیا ہے۔ اور اس پر بعض بنکوں میں عمل ہو رہا ہے۔ جس کا فارمولا یہ وضع کیا گیا ہے کہ پہلے تو اس کے مماطل ہونے کی تحقیق کے لئے ایک ماہ تک اس کو نوٹس دیئے جائیں گے اگر ایک ماہ کے نوٹس کے باوجود بھی اس نے ادائیگی نہ کی تو اب اس نے جتنی مدت تاخیر کی ہے، دیکھا جائے گا کہ بنک کے "انوسٹمنٹ اکاؤنٹ" (حساب الاستثمار) میں اس مدت میں کتنا نفع ہوا ہے۔ اسی حساب سے اس پر جرمانہ لازم کیا جائے گا جو حکومت کو نہیں، بلکہ متضرر فریق یعنی بنک کو ملے گا۔ مثلاً بنک کے انوسٹمنٹ اکاؤنٹ میں پانچ فیصد نفع ہوا ہے تو دین کا پانچ فیصد اس پر بطور جرمانہ کے لازم ہو گا۔ اگر بنک کو اس دوران کوئی نفع نہیں ہوا تو اس سے بھی کچھ نہیں لیا جائیگا۔

لیکن اکثر علماء "تعویض مالی" کے قائل نہیں۔ اس کے جواز پر جو دلائل پیش

کئے جاتے ہیں وہ مخدوش ہیں۔ (اس کی تفصیل میرے رسالہ "احکام البیع بالتقسیط" میں موجود ہے) شرعاً تو اس کا جواز مخدوش ہے ہی، عملاً بھی مفید نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مدیون پر ادائیگی کے لئے دباؤ نہیں پڑے گا۔ اس لئے کہ "انوسٹمنٹ اکاؤنٹ" کا نفع عموماً کم ہوتا ہے اور مرابحہ کی شرح زیادہ ہوتی ہے، لہٰذا کوئی شخص زیادہ شرح کے ساتھ طویل مدت کے لئے مرابحہ کرنے کی بجائے کم مدت کے لئے مرابحہ کرکے ادائیگی میں تاخیر کریگا اور "تعویض مالی" کو برداشت کرلے گا اور اس میں اپنے لئے دباؤ نہیں، بلکہ نفع محسوس کرے گا ـــــــــ لہٰذا تاخیر کے سدباب کا معقول طریقہ وہ ہے جو میں نے ابتداءً پیش کیا تھا اور بعد میں کافی مقبول ہوا۔ وہ یہ کہ مرابحہ یا اجارہ کے معاہدے (Agreement) میں مدیون یہ بات بھی لکھے کہ اگر میں نے ادائیگی میں تاخیر کی تو اتنی رقم کسی خیراتی کام میں خرچ کروں گا۔ یہ رقم دین کے تناسب سے بھی طے کی جا سکتی ہے۔ ایسی رقم سے ایک خیراتی فنڈ بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس فنڈ سے کسی کی امداد بھی کی جا سکتی ہے اور اس سے لوگوں کو بلاسود قرض بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ رقم بنک کی آمدنی میں شامل نہیں ہوگی۔ یہ طریقہ زیادہ مفید اس لئے ہے کہ اس طریقے میں رقم کی شرح متعین نہیں زیادہ سے زیادہ بھی رکھی جا سکتی ہے، اس سے مدیون پر دباؤ ہوگا۔

اس کا جواز یہ ہے کہ یہ رقم نہ جرمانہ ہے اور نہ ربوا، بلکہ مدیون کی طرف سے التزام ہے، جس کو "یمین اللجاج" کہتے ہیں۔ اس التزام کا ذکر امام حطاب ﷺ نے اپنی کتاب "تحریر الکلام فی مسائل الالتزام" میں کیا ہے۔

"اما اذا التزم المدعی علیہ للمدعی انہ ان لم یوفہ حقہ فی وقت کذا و کذا فلہ علیہ کذا و کذا فھذا لا یختلف فی بطلانہ لانہ صریح الربا ـــــ الی قولہ : و اما اذا التزم انہ ان لم یوفہ حقہ فی وقت کذا فعلیہ کذا لفلان او صدقۃ للمساکین فھذا ھو محل الخلاف المعقود لہ ھذا الباب فالمشھور انہ لا یقضی بہ کما تقدم و قال ابن دینار یقضی بہ" (ص ۱۷٦، طبع بیروت)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ التزام دیانۃً بالاتفاق لازم ہوتا ہے۔ اور قضاءً لازم ہونے میں اختلاف ہے۔ موجودہ ضرورت کی بناء پر ان حضرات کے قول پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں، جو قضاءً بھی اس کے لازم ہونے کے قائل ہیں۔

قبل از وقت ادائیگی کی صورت میں دین میں کمی کرنا

اگر مدیون اپنا قرضہ مقررہ وقت سے پہلے ادا کردے تو سودی نظام میں سود کم ہو

جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرابحہ کے ثمن میں کمی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟
اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔

(۱) ایک پہلو وہ ہے جس کو فقہاء کے ہاں "ضع وتعجل" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یعنی مدیون اپنے دائن سے یہ کہے کہ تم دین کی کمی کر کے قبل از وقت وصول کر لو۔اس کے حکم میں فقہاء کا مشہور اختلاف ہے 'لیکن جمہور کے ہاں ناجائز ہے اور یہی صحیح ہے۔(دلائل کی تفصیل رسالہ "احکام البیع بالتقسیط" میں ہے)

(۲) بعض متاخرین حنفیہ نے مرابحہ مؤجلہ میں حلول اجل سے پہلے ادائیگی کی صورت میں ثمن میں کمی کرنا جائز قرار دیدیا ہے۔

لیکن بنکوں کو اگر اس کی کھلی چھوٹ دیدی جائے تو مرابحہ اور سودی نظام میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا' اس لئے مناسب یہ ہے کہ معاہدے میں تو یہ صراحت نہ ہو کہ پہلے ادائیگی کرنے سے قیمت کم ہو جائیگی 'لیکن اگر کوئی شخص قبل از وقت ادائیگی کردے تو اس وقت کسی سابق قرار داد کے بغیر کمی کردی جائے تو مضائقہ نہیں۔

اسلامی طریقہائے تمویل کی جزوی تطبیق

اب تک تمویل کے وہ طریقے اصولی طور پر بتائے گئے ہیں جو شرعی اصولوں کے مطابق ہو سکتے ہیں۔اب یہ بات قابل غور ہے کہ ان طریقوں کی بنک کی جزئیات پر تطبیق کیسے ہو؟ جب تک بنک کے ایک ایک جزوی معاملے پر ان طریقوں کو منطبق نہ کیا جائے تو عملی طور پر نظام چلانا مشکل ہے 'اس لئے اب بنک کے جزوی معاملات پر مختصراً گفتگو کی جاتی ہے۔

یہ بات پہلے (بنک کے وظائف بیان کرتے ہوئے) تفصیل سے بتائی جاچکی ہے کہ بنک کی تمویل کے تین طریقے ہوتے ہیں۔تمویل کی تین صورتوں کو شرعی سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہ غور کرنا ہوگا کہ یہاں کونسا اسلامی طریقہ تمویل اختیار کیا جائے۔

"تمویل المشاریع" (Project Financing) میں شرکت 'مضاربہ' اجارہ اور مرابحہ سب طریقوں سے تمویل ہو سکتی ہے۔اجارہ اس طرح کہ مشینری خرید کر بنک اجارے پر دیدے۔مرابحہ اس طرح کہ مشینری خرید کر نفع پر مرابحۃً بیچ دی جائے۔شرکت اور مضاربہ کو طویل المیعاد تمویل میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

"تمویل رأس المال العامل" (Working Capital Financing) میں خاص معاملات کی حد تک مشارکہ اور مضاربہ ہو سکتا ہے۔مثلاً بنک جو سرمایہ دے رہا ہے

اس سے روئی خریدی جائے گی، اس سے کپڑا وغیرہ بنا کر جو نفع حاصل ہوگا اس میں بنک شریک ہوگا۔اور خام مال کی ضرورت ہو تو اس میں مرابحہ بھی ہو سکتا ہے۔
(Over Head Expenses) (وہ اخراجات جن کا براہ راست پیداوار سے تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً تنخواہیں، کرایہ جات، بلوں کی ادائیگی وغیرہ) ان میں تمویل بہت مشکل ہے۔یہاں اجارے اور مرابحہ کا امکان ہی نہیں۔یہاں دو ہی راستے ہیں ایک مشارکہ کا طریقہ ہے۔جتنی رقم کی ضرورت ہے، بنک اتنی رقم دے کر کاروبار کے کسی حصے میں شریک ہو جائے۔جب بطور شرکت کے ادارے کو رقم مل گئی تو وہ کاروبار کی کسی بھی ضرورت میں خرچ کر سکتا ہے۔دوسرا طریقہ بلاسود قرض کا ہے اس میں بنک وہ اخراجات لے سکتا ہے جو اس قرض کا حساب کتاب رکھنے کے لئے ہوئے ہیں۔اس میں اصل تو یہی ہے کہ حقیقی اخراجات وصول کئے جائیں۔مگر ایک ایک قرضے پر ہونے والے حقیقی اخراجات معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔اس لئے اس بات کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ بنک انتظامی کاموں کی "اجرت مثل" وصول کرلے 'اجرت مثل سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ فتویٰ پر اجرت لینا ناجائز ہے، مگر کتابتِ فتویٰ کی اجرت لینا جائز ہے۔یہاں فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کتابت کی اجرت "اجرت مثل" سے متجاوز نہیں ہونی چاہئے۔

در آمد میں اسلامی بنکوں کا کردار

پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ موجودہ نظام میں بنک کا در آمد اور بر آمد میں بھی بڑا کردار ہوتا ہے۔ در آمد (Import) کی صورت میں بنک ایل سی کھولتا ہے اس پر اپنی خدمت کی اجرت، کفالت کی اجرت اور قرض ہو تو اس پر سود بھی لیتا ہے۔(جیسا کہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے) شرعی نقطۂ نظر سے کفالت کی اجرت اور قرض پر سود لینا شرعاً جائز نہیں تو ایل سی کے متبادل دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔
موجودہ اسلامی بنکوں میں عام طور پر ایل سی کے معاملات مرابحہ کے طور پر انجام پاتے ہیں۔وہ اس طرح کہ جس چیز کو در آمد کرنا تھا بنک اس میں وکیل بننے کی بجائے خود اسکو خرید کر در آمد کرتا ہے اور مرابحۃً اس شخص کو بیچ دیتا ہے۔جو در آمد کرنا چاہتا تھا، ایل سی کی فیس وغیرہ کو مرابحہ کی شرح میں شامل کر لیتا ہے۔مرابحہ کی شرائط ملحوظ رکھی جائیں تو اصولی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں، تاہم عملاً یہ طریقہ پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا۔اس کی کئی وجوہ ہیں۔ایک یہ کہ اس طریقے میں بہت سے مراحل پر مرابحہ کی شرائط پوری کرنا مشکل ہوتا ہے اور بسا اوقات عملاً بہت سی شرائط پوری بھی نہیں ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں بنک کا اس چیز کو خرید کر مرابحہ کرنا محض ایک معنوی

کارروائی ہے۔اس لئے کہ درآمد کنندہ پہلے بائع سے پورا معاملہ طے کرچکا ہوتا ہے صرف منگوانے کے وقت بنک بیچ میں آجاتا ہے' سرکاری کاغذات میں اور قانونی اعتبار سے درآمد کنندہ (Importer) بنک کو نہیں سمجھا جاتا' بلکہ اصل مشتری کو ہی سمجھا جاتا ہے دوسرے ملک سے جو بائع مال بھیجتا ہے وہ بھی بنک کو خریدار نہیں سمجھتا ہے۔تیسری وجہ یہ ہے کہ مرابحہ کے جواز کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ چیز جو درآمد کی جارہی ہے' پہلے بنک کے ضمان میں آئے' جب کہ بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا ہے ---------- ان وجوہ کی بناء پر ایل' سی کا معاملہ مرابحہ کے طور پر کرنا پسندیدہ نہیں' تاہم اگر مرابحہ کی شرائط کا لحاظ صحیح شرعی طریقے سے ہو تو معاملہ جائز ہے۔

ایل' سی کا صحیح متبادل یہ ہے کہ یہ معاملہ شرکت یا مضاربت کے طریقے پر کیا جائے۔اگر ایل' سی زیرو مارجن پر ہو تو مضاربہ ہوگا اور بنک رب المال اور امپورٹر مضارب ہوگا۔اور اگر ایل' سی کھلوانے والا بھی کچھ رقم لگا رہا ہے تو شرکت ہوگی۔ مشارکہ یا مضاربہ کی صورت یہ ہوگی کہ بنک امپورٹر سے کہے گا کہ مال کی قیمت ہم ادا کردیتے ہیں اور مال کو بیچنے سے جو نفع آئے گا وہ طے شدہ تناسب سے تقسیم کرلیا جائے گا۔ اس میں یہ صورت بھی قابل غور ہو سکتی ہے کہ بنک ایک مخصوص مدت کیلئے مشارکہ کرے' اس وقت تک اگر سامان فروخت ہو کر نقد رقم مل گئی تو نفع طے شدہ تناسب سے تقسیم کرلیا جائے اور اگر سامان بازار میں فروخت نہیں ہوا تو امپورٹر بنک کا حصہ خرید کر اسے ادائیگی کردے۔

برآمد میں اسلامی بنکوں کا کردار

برآمد کے سلسلے میں بنک کے دو کردار ہیں۔ایک یہ کہ وہ ایکسپورٹر کا بنک (Negotiating Bank) ہونے کی حیثیت سے کئی خدمات انجام دیتا ہے۔مثلاً مال روانہ کرنے کے کاغذات (Bill of Lading) بھیجتا ہے' امپورٹر سے رقم وصول کرتا ہے اور ان خدمات کی اجرت وصول کرتا ہے وغیرہ۔اس میں تو شرعاً کوئی اشکال نہیں' اس لئے کہ یہ تمام افعال ایسے ہیں' جن کی اجرت لینا جائز ہے۔بنک کا دوسرا کردار یہ ہے کہ برآمد کنندہ (Exporter) کو مال خریدنے یا تیار کرانے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سرمایہ بنک فراہم کرتے ہیں' جس کو "تمویل الصادرات" (Export Financing) کہتے ہیں۔"تمویل الصادرات" کی دو قسمیں ہیں' ان دونوں کو سمجھ کر دونوں کا شرعی طریق کار الگ الگ سمجھنا چاہئے ------- تمویل کی ایک قسم یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس باہر سے آرڈر ہے' مگر مال خریدنے اور تیار کرنے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔اس مقصد کے لئے بنک تمویل کرتا ہے۔اس کو "تمویل قبل الشحن" (Pre

Shipment Financing) کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایکسپورٹر نے مال خرید کر تیار کر کے بھیج دیا ہے' مگر رقم آنے میں کچھ دیر لگے گی' اتنی مدت کے لئے وہ چاہتا ہے کہ بنک سے اتنی رقم مل جائے۔ اس کو "تمویل بعد الشحن" (Post Shipment Financing) کہتے ہیں۔ سودی نظام میں تو ان دونوں صورتوں میں سود پر قرضہ دیدیا جاتا ہے۔ان دونوں قسم کی تمویل کا شرعی طریقہ کیا ہو؟ یہاں اس پر گفتگو کرنی ہے۔

پہلی قسم یعنی "تمویل قبل الشحن" کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔

(۱)---بہت سے اسلامی بنکوں میں یہ صورت چل رہی ہے کہ بنک ایکسپورٹر سے وہ مال خود خرید کر اس کو قیمت ادا کر دیتا ہے۔ایکسپورٹر نے اپنے امپورٹر سے جو قیمت طے کی ہوتی ہے' بنک اس سے کم قیمت پر مال ایکسپورٹر سے خریدتا ہے اور ایکسپورٹر نے جو قیمت غیر ملکی خریدار سے طے کر رکھی ہے اس پر اپنی طرف سے مال اسکو روانہ کرتا ہے جس سے بنک کو نفع ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طریق کار میں کئی قباحتیں ہیں۔ وہ یہ کہ اس طریقے میں بیع کے شرعی تقاضے عموماً پورے نہیں ہوتے ہیں۔ مثلاً اب ایکسپورٹر بنک کو قرار دینا چاہئے۔ مگر بنک کے اس مال کو خرید لینے کے بعد بھی عمیل (جو شخص بنک سے سرمایہ لینے آیا تھا) کو ہی ایکسپورٹر سمجھا جاتا ہے اور ایکسپورٹ کی سرکاری مراعات بھی اسی کو ملتی ہیں۔ دوسرے ملک میں مال منگوانے والا (Importer) بھی بنک کو بائع نہیں سمجھتا' عمیل ہی کو سمجھتا ہے' حتیٰ کہ مال میں عیب وغیرہ کا دعویٰ بھی عموماً عمیل پر ہی ہوتا ہے' بنک پر نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بیع محض ایک مصنوعی کارروائی ہے۔ اگر قباحتوں کو دور کر کے واقعتاً بیع کی حقیقت پائی جائے تو یہ طریقہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔

یہاں ایک ضمنی وضاحت ضروری ہے کہ موجودہ نظام میں بھی مال روانہ کرنے کے کاغذات (Bill of Lading) وغیرہ بنک کے نام پر ہی بنتے ہیں۔ اس پر (To The Order Of The Bank) لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اور رقم اور کاغذات کی وصولی بھی بنک ہی کرتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہئے کہ حقوق عقد بنک کی طرف راجع ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ بنک کا نام اس لئے نہیں لکھا جاتا کہ وہ حقیقتاً عاقد ہے' بلکہ بنک کا نام صرف بطور وثیقے کے لکھا جاتا ہے' جب تک بنک اور عمیل کے معاملات صاف نہ ہوں گے' بنک کاغذات نہیں دے گا۔

(۲)---اس تمویل کی بہتر صورت یہ ہے کہ بنک اور عمیل کے درمیان شرکت یا مضاربہ کا معاہدہ ہو۔ اگر عمیل بھی کچھ سرمایہ لگا رہا ہو تو شرکت ہوگی اور اگر وہ اپنا سرمایہ نہ لگا رہا ہو تو مضاربہ کا عقد ہو گا۔ عمیل بنک سے سرمایہ لیکر مال خریدے گا یا تیار کریگا پھر باہر بھیجے گا

اور جو نفع ہو گا وہ تقسیم ہو جائے گا۔ اس صورت میں مشارکہ یا مضاربہ آسان بھی ہے' اس لئے کہ عمیل کا دوسرے ملک کے خریدار (امپورٹر) سے معاہدہ ہو چکا ہے اور قیمت بھی طے ہو چکی ہے' ادھر مال کی تیاری پر لاگت کا بھی اندازہ ہے۔ تو اس بات کا بسہولت اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس معاملے کے نتیجے میں کتنا نفع ہو گا؟ ---------- البتہ اس میں ایک مشکل ہو سکتی ہے کہ عمیل نے مال مطلوبہ صفات کے خلاف بھیج دیا تو دوسری طرف مال وصول نہیں کیا جائے گا اور اس میں بنک کا بھی نقصان ہو گا۔ اس کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ مشارکہ یا مضاربہ کے معاہدے میں بنک یہ شرط لگا دے کہ مال مطلوبہ صفات کے مطابق بھیجنا ہو گا۔ اب بھی اگر اس نے مطلوبہ صفات کے خلاف مال بھیجا تو اس کا ذمہ دار وہ عمیل ہو گا' بنک اس کا ذمہ دار نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ شرط کی مخالفت کی وجہ سے یہ عمیل کی طرف سے تعدّی ہے۔ اور تعدّی کی صورت میں شریک یا مضارب کو ضامن بنایا جا سکتا ہے۔

"تمویل بعد الشحن" (Post Shipment Financing) اس کا وہی طریقہ ہوتا ہے جو "بل آف ایکسچینج" کی ڈسکاؤنٹنگ کا ہوتا ہے۔ ایکسپورٹر مال روانہ کر چکا ہے۔ اب اس کے پاس اس مال کا بل ہے' اس بل کو وہ بنک کے حوالے کر دیتا ہے اور بنک اس کی پختگی (Maturity) کو سامنے رکھ کر اس میں کٹوتی کر کے باقی رقم ایکسپورٹر کو دیدیتا ہے اور پختگی (Maturity) کی تاریخ آنے پر بنک یہ رقم امپورٹر سے وصول کر لیتا ہے۔ جیسا کہ بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

یہاں پہلے "خصم الکمبیالہ" (بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ) کے شرعی حکم پر گفتگو کی جاتی ہے۔ ڈسکاؤنٹنگ کی فقہی حیثیت یہ ہے کہ دائن جس کے ہاتھ میں بل ہے وہ دین کا بٹہ لگانے والے (Discounter) کی طرف حوالہ کر دیتا ہے۔ اور یہ حوالہ بالنقص من الدین ہے جو ناجائز ہے' اس لئے کہ یہ ربو الفضل ہے۔ ڈسکاؤنٹنگ کے اس معاملے کو "بیع الدین" نہیں کہا جا سکتا' اس لئے کہ بیع اور حوالہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ بیع کے بعد دائن بری الذمہ ہو جاتا ہے اور دین کے تمام حقوق اس شخص کی طرف راجع ہو جاتے ہیں جس سے دین کو خریدنا ہوتا ہے۔ اور "حوالہ" میں محیل ہی دائن رہتا ہے' وہ بری الذمہ نہیں ہوتا' اگر محتال کو دین نہ ملے تو وہ محیل کی طرف رجوع کا حق دار ہوتا ہے' اور آج کل ڈسکاؤنٹنگ میں صورت حال یہی ہوتی ہے کہ اگر بٹہ لگانے والے (Discounter) کو بل وصول نہ ہو تو وہ اصل دائن سے رجوع کرتا ہے لہٰذا یہ "بیع الدین من غیر من علیہ الدین" نہیں' بلکہ "حوالۃ الدین بالنقص من الدین" ہے۔

اس کی متبادل صورت کیلئے شروع میں احقر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ یہاں دو معاملے الگ

الگ کیے جائیں ۔ایک یہ کہ بل میں کٹوتی کرنے کے بعد جتنی رقم باقی بچتی ہے اتنی رقم کا قرض لے لیا جائے ۔دوسرا معاملہ یہ ہے کہ اس کو دین وصول کرنے کا وکیل بنادے اور اس وکالت پر اجرت طے کردے ۔اب بنک بہ حیثیت وکیل دین وصول کرکے اس میں سے اپنی اجرت وصول کرلے اور باقی سے دین کا مقاصہ کرلے ۔مثلاً سو روپے کا بل ہو تو بنک نوّے روپے قرض دیدے اور بنک کو بل وصول کرنے کا وکیل بنادیا جائے جس کی اجرت دس روپے ہوگی ۔اب بنک تاریخ آنے پر سو روپے وصول کرکے اس میں سے دس روپے اپنی اجرت رکھ لے اور نوّے روپے سے اپنے دین کا مقاصہ کرلے

——— لیکن اس تجویز میں دو باتیں قابل غور ہیں ۔ایک یہ کہ عموماً وکالت کی اجرت کو بل کی رقم کی تعداد کے ساتھ مربوط کیا جائے گا ۔بل کی رقم زیادہ ہو تو اجرت بھی زیادہ ہوگی اور رقم کم ہو تو اجرت بھی کم ہوگی ۔دوسری بات یہ کہ اجرت کو مدت کے ساتھ بھی مربوط کیا جائے گا ۔بل کی پختگی زیادہ مدت کے بعد ہونی ہو تو اجرت زیادہ ہوگی اور پختگی کم مدت میں ہونی ہو تو اجرت کم ہوگی ۔اب یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اجرت کو رقم کی تعداد اور مدتِ پختگی کے ساتھ مربوط کرنا درست ہے یا نہیں؟ اجرت کو رقم کی تعداد کیساتھ مربوط کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دلالی (سمسرۃ) کی اجرت کو مالیت کے ساتھ وابستہ کرنے میں اختلاف ہے، لیکن علامہ شامیؒ نے جواز کو ترجیح دی ہے [1] یعنی دلال نے زیادہ مالیت کی چیز بیچی ہے تو زیادہ اجرت لینا اور کم مالیت کی چیز میں دلال بنا ہے تو کم اجرت لینا جائز ہے ۔اس کی جو وجہ علامہ شامیؒ نے لکھی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ گو یہاں مالیت کم یا زیادہ ہونے کی صورت میں دلال کی محنت اور عمل برابر ہے، مگر اجرت مقرر کرتے ہوئے صرف عمل اور محنت کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اجرت مقرر ہونے میں عمل کی قدر اور نوعیت کا بھی دخل ہوتا ہے ۔کم مالیت کی چیز کی دلالی کی قدر کم ہے، اور زیادہ مالیت کی چیز کی قدر زیادہ ہے لہٰذا اس کی بناء پر اجرت میں بھی کمی، بیشی ہوسکتی ہے [2] اس پر قیاس کرتے ہوئے وکالت کی اجرت کو مقدار رقم کے ساتھ وابستہ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، مگر اجرت کو مدت اور زمانے کے ساتھ مربوط کرنے کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا ۔اس لئے کہ یہ "عینہ" والی شکل ہے کہ بلا سود قرض دیکر قرض کی مدت کے حساب سے وکالت کی اجرت وصول کرلی گئی یعنی جو سود قرض پر

---

[1] الدر المختار ج ۶ ص ۶۳ باب الاجارۃ الفاسدۃ

[2] الدر المختار ۔ کتاب الاجارۃ ۔ مسائل شتی ج ۶ ص ۹۳ ۔ ایچ ۔ ایم سعید کمپنی

نہیں لیا جاسکتا' وہ وکالت کی اجرت بڑھاکر وصول کرلیا گیا اس لئے یہ تجویز پسندیدہ نہیں۔ لہذا جب تک "تمویل بعد الشحن" کی کوئی بے غبار شرعی صورت سامنے نہ آئے' اس وقت تک اس قسم کی تمویل بند ہی رکھنی ہوگی اور تمام معاملات "تمویل قبل الشحن" (Pre- Shipment Financing) ہی کی بنیاد پر کئے جائیں گے' اور اگر ایکسپورٹ کی قیمت حاصل ہونے سے پہلے ایکسپورٹر کو رقم کی ضرورت ہو تو وہ بینک سے کوئی نیا مشارکہ' مضاربہ' یا مرابحہ کر سکتا ہے۔

"اعادۃ تمویل الصادرات" کا حکم

درآمد' برآمد میں بینک کا کردار بیان کرتے ہوئے یہ بات بتائی جاچکی ہے کہ "اسٹیٹ بینک آف پاکستان" نے برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک اسکیم جاری کی ہے' جس کو (Export Refinancing Scheme) "اعادۃ تمویل الصادرات" کہتے ہیں۔ اس اسکیم کے دو طریقوں کی وضاحت بھی وہاں ہو چکی ہے۔ یہاں ان کے شرعی حکم پر گفتگو پیش نظر ہے۔

اس اسکیم کا پہلا طریقہ یہ تھا کہ "اسٹیٹ بینک" تجارتی بینکوں کو قرض دیتا تھا اور اس پر پانچ فیصد سود لیتا تھا اس کے سود ہونے میں تأمل کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ طریقہ ختم کر کے جو نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے' اس میں "اسٹیٹ بینک" تجارتی بینک کو باقاعدہ قرض نہیں دیتا بلکہ اس کے نام اکاؤنٹ کھول دیتا ہے' جس میں سے تجارتی بینک کو رقم لینے کا حق نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت میں قرض کا معاملہ نہیں' بلکہ محض ایک کاغذی کارروائی (جرنل) ہے۔ اس پر "اسٹیٹ بینک" ٹریژری بل کے حساب سے جو رقم تجارتی بینک کو دیتا ہے' اس پر بھی اشکال نہیں۔ اس لئے کہ وہ اسٹیٹ بینک کی طرف سے ایکسپورٹ کی حوصلہ افزائی کے لئے ابتداءً انعام کی حیثیت میں ہے' کسی معاملے کے نتیجے میں نہیں۔ البتہ اسٹیٹ بینک تجارتی بینک سے پانچ فیصد لے کر یہ نفع دیتا ہے جو عموماً ۱۳ یا ۱۴ فیصد ہوتا ہے' اس میں ربوا الفضل کا شبہ ہے۔ لہذا اگر اسٹیٹ بینک پانچ فیصد تجارتی بینک سے لینا چھوڑ دے' اس کی بجائے وہ اس نفع کی مقدار کم کردے جو وہ خود دے رہا ہے' مثلاً ۱۳ فیصد کی بجائے ۸ فیصد کردے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور سب سے بے غبار طریقہ یہ ہے کہ چونکہ اسٹیٹ بینک کا اصل مقصد برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لئے بینکوں کو امداد (Subsidy) دینا ہے' تاکہ وہ کم نفع رکھ کر برآمدات کی تمویل کریں۔ لہذا اس کے لئے وہ براہ راست امداد دے۔

غیر مصرفی مالیاتی اداروں کا شرعی حکم

اس سے پہلے (N.B.F.I) (Non- Banking Financial Institutions)
یعنی المؤسسات المالیۃ غیر المصرفیۃ کا اور ان کی اقسام کا قدرے تعارف پیش کیا جا چکا ہے۔ اس وقت ان میں سے اکثر مالیاتی ادارے سودی ہیں۔ ان کا بنیادی کام تمویل ہی ہے' لہٰذا ان کو شرعی اصولوں کے مطابق چلانے کا طریق کار بھی وہی ہو گا جو بنکوں کے بارے میں پیش کیا گیا ہے۔ البتہ یہاں ان چار اداروں پر گفتگو ہو جانی چاہئے جن کو "اسلامی نظریاتی کونسل" نے سب سے پہلے سود سے پاک کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ چار ادارے یہ تھے۔

(۱) (N.I.T) (۲) (I.C.P) (۳) (H.B.F.C) (۴) اسمالی انڈسٹریز فنانس کارپوریشن۔ ان کو سود سے پاک کرنا آسان تھا' اس لئے "اسلامی نظریاتی کونسل" نے سب سے پہلے ان کے بارے میں تجاویز پیش کی تھیں۔ یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱)——(N.I.T) : پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ ادارہ (نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ) دس روپے کی قیمت اسمیہ (Face Value) کے یونٹ جاری کرتا ہے' لوگ یونٹ لے کر اپنی رقم جمع کراتے ہیں۔ ان رقموں سے جو فنڈ تیار ہوتا ہے اس سے سرمایہ کاری کی جاتی ہے اور نفع (Dividend) کی شکل میں یونٹ ہولڈرز میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے نظام پر جب غور کیا گیا تو اس میں دو باتیں قابل اشکال سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ (N.I.T) کی زیادہ سرمایہ کاری شیئرز میں ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں ہر طرح کی کمپنی کے شیئرز لے لئے جاتے تھے۔ بنک اور سودی اداروں کے شیئرز اور ایسی کمپنیوں کے شیئرز بھی لئے جاتے تھے جن کا بنیادی کاروبار ہی حرام ہے۔ اس کے تدارک کے لئے (N.I.T) کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ سودی اور حرام کاروبار والے اداروں اور کمپنیوں کے شیئرز نہیں لئے جائیں گے۔ دوسرا اشکال یہ تھا کہ (N.I.T) کے یونٹ ہولڈرز کو اعتماد میں لینے کے لئے حکومت نے اس بات کی ضمانت دی ہوئی تھی کہ اگر نقصان ہوا تو حکومت ادا کرے گی' بلکہ نفع نہ ہونے کی صورت میں ڈھائی فیصد تک نفع بھی حکومت دے گی' جب کہ حکومت خود (N.I.T) میں شریک بھی تھی۔ اور ایک شریک کا دوسرے شرکاء کے لئے نقصان کا ضامن بننا یا نفع کا ذمہ دار بننا جائز نہیں۔ اس اشکال کو حل کرنے کے لئے یہ تجویز زیر غور آئی کہ حکومت (N.I.T) سے اپنا حصہ ختم کرلے تو پھر یہ شریک کی ضمانت نہیں ہوگی' بلکہ طرف ثالث کی ضمانت ہوگی۔ لہٰذا یہ بات قابل غور بن گئی کہ طرف ثالث کا نفع نہ ہونے کی صورت میں ڈھائی فیصد کی حد تک نفع کا اور نقصان کی صورت میں نقصان کا ضامن بننا درست ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی رو سے تو اس کی گنجائش نہیں جس کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) کفالت اس حق کی صحیح ہوتی ہے جو خود لازم اور مضمون ہو۔ یہی وجہ ہے کہ "ودیعت" اور "عاریت" کی کفالت صحیح نہیں ہوتی۔ شرکت اور مضاربہ میں سرمایہ مضمون نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے نقصان کی کفالت لازم و نافذ نہیں ہوگی۔ یہ محض ایک وعدہ ہوگا جو قضاءً لازم نہیں ہوتا۔ (۲) ھدایہ وغیرہ میں ہے "ضمان الخسران باطل" جس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو کہے کہ تم یہ عقد یا کاروبار کرلو' اگر اس میں خسارہ ہوا تو میں ضامن ہوں گا تو ضمانت باطل ہے' نافذ نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ البتہ مالکیہ کے ہاں طرف ثالث کی یہ ضمانت قضاءً لازم ہو سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسا وعدہ جس کی وجہ سے موعود لہ کو کسی مؤنۃ میں داخل کیا گیا ہو یا اس کو کسی کام پر آمادہ کیا گیا ہو وہ قضاءً بھی لازم ہو جاتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں حکومت نے طرف ثالث ہونے کی حیثیت سے ڈھائی فیصد نفع اور نقصان نہ ہونے کی ضمانت دے کر لوگوں کو (N.I.T) میں شرکت کی دعوت دی ہے اس لئے یہ ضمانت قضاءً بھی نافذ ہوگی۔[۱] لہٰذا طرف ثالث کی ضمانت کو نافذ قرار دے کر حکومت کا حصہ (N.I.T) سے ختم کر دیا گیا۔ اور اس ضمانت کو نافذ قرار دیدیا گیا یہی وجہ ہے کہ (N.I.T) کے اشتہارات میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ ڈھائی فیصد نفع یقینی ہے۔

چنانچہ ان تجاویز کی روشنی میں حکومت کی طرف سے احکام جاری ہوئے اور ابتداءً (N.I.T) نے انکے مطابق کام بھی کیا مگر کارکردگی کی مسلسل نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے (N.I.T) میں تبدیلی آئی' اس کی وجہ سے نظام پھر غیر شرعی بن گیا' تبدیلی یہ آئی کہ (N.I.T) کے پاس سرمایہ زیادہ جمع ہوگیا۔ اور شیئرز میں سرمایہ کاری کو ناکافی سمجھا گیا تو (N.I.T) نے اور کئی طریقوں سے سرمایہ کاری شروع کر دی اور وہ طریقے شرعاً ناجائز تھے۔ مثلاً

---

[۱] بعض علماء نے فقہ حنفی سے "ضمان خطر الطریق" والے جزیے کی رو سے حنفیہ کے ہاں بھی اس ضمانت کو لازم قرار دیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی نے دوسرے کو کہا "اسلک هذا الطریق فانه آمن فان هلک مالک فعلی" اس کے کہنے پر وہ اس راستے پر چلا اور اس کا مال ضائع ہوگیا تو وہ ضامن ہوگا (شامی ص ۲۰۷ ج ۴ کتاب الجہاد) یہاں یہ ضمان اس شخص پر فی نفسہ لازم نہیں تھا' صرف اس وعدہ کی وجہ سے لازم ہوا ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی طرف ثالث کے وعدے کی وجہ سے یہ ضمان لازم قرار دیا جا سکتا ہے' لیکن یہ قیاس صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ "ضمان خطر الطریق" کے لازم ہونے کی علت دھوکا ہے۔ یہ کہہ کر کہ اس راستے میں نقصان نہیں ہوگا اس نے دھوکہ دیا ہے۔ مگر زیر بحث صورت میں حکومت کی طرف سے دھوکا نہیں' اس لئے کہ حکومت کی ضمانت کا یہ مطلب نہیں کہ (N.I.T) میں نقصان ہوگا ہی نہیں۔ حکومت کا مقصد تو سرمایہ کاری کی ترغیب کے لئے تحفظ کا احساس دلانا ہے۔

(۱) مارک اپ پر کاروبار شروع کر دیا اور مارک اپ کا وہی غیر شرعی طریقہ اختیار کیا گیا جو بنکوں میں چلتا ہے۔
(۲) بنکوں کی طرح اجارہ شروع کر دیا جس میں وہ شرعی خامیاں موجود تھیں جو پہلے بتائی گئی ہیں۔
(۳)(P.T.C) کی ناجائز شکل اختیار کی گئی۔ پی' ٹی' سی کی حقیقت اور اس کا پس منظر سمجھنا بھی یہاں ضروری ہے۔
"اسلامی نظریاتی کونسل" نے معیشت کو سود سے پاک کرنے کی جو تجاویز پیش کی تھیں' ان میں (P.T.C) (پی' ٹی' سی) کی تجویز بھی شامل تھی۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کمپنی کو کبھی سرمائے کی فراہمی کے لئے بانڈز جاری کرنے پڑتے ہیں جو سودی ہوتے ہیں۔ اس کا متبادل یہ پیش کیا گیا تھا کہ کمپنی مضاربہ کی دستاویزات جاری کرے گی۔ جس کا نام (Participation Term Certificate) (پارٹیسپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ) ہوگا۔ یہ ایک معینہ مدت کے لئے مضاربہ کے سرٹیفکیٹ ہوں گے۔ جو شخص یہ سرٹیفکیٹ حاصل کریگا وہ اس معینہ مدت میں کمپنی کے اثاثوں میں شریک ہو جائے گا۔ بوقت ضرورت وہ اپنے اس حصے کو بیچ بھی سکے گا ———— یہ تجویز بعد میں کمپنی لاء کا حصہ بنی اور متعدد کمپنیوں نے "پی' ٹی' سی" جاری کئے۔ این' آئی' ٹی نے بھی جاری کرنے شروع کر دیئے' لیکن اس میں پیچیدہ قسم کی تبدیلیاں کر کے اس کو جاری کیا گیا' جس کی وجہ سے یہ ناجائز شکل اختیار کر گئے۔
(۴) طویل المیعاد سرمایہ کاری کے لئے ٹی ایف سی جاری کئے گئے یعنی پی' ٹی' سی سے ملتے جلتے دستاویزات جاری کئے گئے جن کا نام (Term Financ Certificate) (ٹرم فائنس سرٹیفکیٹ) تھا۔

اس کے بعد این' آئی' ٹی کے کاروبار میں پھر کچھ اصلاح ہوئی۔ جس میں مرابحہ اور اجارہ کے معاہدات (Agreements) کو درست کر دیا گیا "پی' ٹی' سی" کو ختم کر دیا گیا اور "ٹی' ایف' سی" کو مرابحہ میں بدل دیا گیا۔ البتہ اب بھی این' آئی' ٹی کی دو مدیں ناجائز ہیں۔ ایک یہ کہ بنکوں کے "پی' ایل' ایس" اکاؤنٹ میں رقم رکھی جاتی ہے' جس کا سود آتا ہے۔ دوسری یہ کہ "پی' ٹی' سی" آئندہ کے لئے تو ختم کر دیئے گئے مگر پہلے سے جو چل رہے ہیں ان میں سے کچھ کی پختگی (Maturity) نہیں ہوئی' یعنی ان کی مدت پوری نہیں ہوئی۔ اس لئے فارم میں یہ شق رکھ دی گئی کہ "میں پی' ایل' ایس اور پی' ٹی' سی کی آمدنی نہیں لینا چاہتا۔" فارم میں یہ لکھ دینے کے بعد این' آئی' ٹی یونٹ لینے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ لیکن اب بھی عملاً کام درست ہونے کا کوئی اعتماد نہیں' جب تک مسلسل

نگرانی کا کوئی انتظام نہ ہو۔

(۲)----(I.C.P) : "انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان" کا تعارف پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔اس کی سرمایہ کاری صرف کمپنیوں کے شیئرز میں ہوتی ہے۔اور اصولی طور پر اس کو اس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ صرف ان کمپنیوں کے شیئرز لئے جائیں جن کا کاروبار بنیادی طور پر جائز ہو۔مگر عملاً ایسا ہو رہا ہے یا نہیں اس کو بیلنس شیٹ وغیرہ میں دیکھ کر حکم بتانا چاہیے۔

(۳)---اسمال انڈسٹریز فنانس کارپوریشن :یہ ادارہ چھوٹی صنعتوں کو سرمایہ فراہم کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔پہلے سود پر قرضے دیتا تھا۔پھر "اسلامی نظریاتی کونسل" نے مرابحہ اجارہ وغیرہ میں تمویل کی سفارش کی۔

(۴)----(H.B.F.C) : ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن۔یہ ادارہ "ہاؤس فنانسنگ" یعنی گھر بنانے یا خریدنے کے لئے سرمایہ فراہم کرتا تھا۔مغربی روایتی ادارے تو اس مقصد کے لئے سود پر قرضے دیتے ہیں اور مکان کو رہن رکھ لیتے ہیں۔

"اسلامی نظریاتی کونسل" نے ہاؤس فنانسنگ کے لئے جو تجویز پیش کی تھی وہ ایک نئی قسم کا معاہدہ تھا جس کو "شرکت متناقصہ" (Decreasing Partnership) کہتے ہیں۔جس کا حاصل یہ ہے کہ تمویلی ادارے اور عمیل (Client) یعنی مکان کے خواہشمند کے مشترک سرمائے سے مکان خریدا یا بنایا جائے گا۔دونوں کے درمیان اپنے اپنے سرمائے کے تناسب سے مکان میں "شرکت ملک" ہوگی۔مثلاً ۲۵ فیصد سرمایہ عمیل کا اور ۷۵ فیصد ادارے کا تھا تو مکان دونوں کے درمیان ارباعاً مشترک ہوگا۔ایک چوتھائی حصہ عمیل کا اور تین چوتھائی حصے ادارے کے ہوں گے۔مکان بننے کے بعد عمیل کارپوریشن کے حصے میں کرایہ دار ہونے کی حیثیت سے رہے گا اور کارپوریشن کو کرایہ ادا کرے گا۔اس کے ساتھ ساتھ مختلف وقفوں میں کارپوریشن کے حصے کو تھوڑا تھوڑا کر کے خریدتا بھی رہے گا۔اس مقصد کے لئے کارپوریشن کے حصے کے متعدد یونٹ بنا لئے جاتے ہیں۔مثلاً کارپوریشن کا حصہ دس یونٹوں میں خریدا جائیگا۔جوں جوں خریدنے کے نتیجے میں کارپوریشن کا حصہ کم ہوتا جائے گا،اسی تناسب سے کرایہ بھی کم ہوتا جائے گا۔جب عمیل کارپوریشن کے سارے حصے کو خرید لے گا تو کارپوریشن کی ملکیت ختم ہو جائے گی اور عمیل سارے مکان کا مالک بن جائے گا۔اب کرایہ دینے کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔

فقہی نقطۂ نظر سے یہاں تین عقود ہوئے۔(۱) شرکت ملک (۲) اجارہ (۳) بیع۔ یہ تینوں عقد بغیر کسی شرط سابق کے الگ الگ ہوں تو ان کے جواز میں کوئی اشکال نہیں۔مگر عملاً یہاں ایک معاہدے میں تین عقد ایک دوسرے کے ساتھ مشروط یا المعروف کالمشروط

ہوں گے اور اس طرح معاہدے کے بغیر چارہ کار بھی نہیں ۔ یہ صورتحال فقہی طور پر قابل غور ہے ۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک عقد میں دوسرے عقد کی شرط لگانا اس وقت ناجائز ہے جب کہ صلب عقد میں دوسرے عقد کی شرط لگائی گئی ہو' لیکن اگر صورتحال یہ ہو کہ ایک دفعہ کئی عقود کا اس طرح اکٹھا معاہدہ کر لیا جائے کہ ابھی کوئی عقد انجام نہیں پا رہا ہے' فی الحال صرف ان کے انجام پانے کا معاہدہ کیا جا رہا ہے ۔ پھر وہ عقود اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے وقت پر انجام پائیں گے اور جب ان میں سے کوئی عقد عملاً ہو رہا ہو گا اس وقت دوسرے عقد کی کوئی شرط نہیں ہو گی تو اس صورت پر "صفقة فی صفقة" یا "بیع و شرط" کے احکام جاری نہیں ہوں گے ۔ اس کی نظیر "بیع بالوفاء" ہے' جس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ وفاء کی شرط صلب بیع میں ہو تو ناجائز ہے ۔ اور اگر بیع مطلق عن الشرط ہو اور وفا کا معاہدۃً بیع الگ سے کیا گیا ہو تو یہ جائز ہے اور وعدۃً وفا تقضاءً بھی لازم ہو جائے گا ۔ بیع کے بعد تو وفا کا جواز بہت سے فقہاء نے لکھا ہے ۔ اور بیع سے پہلے وفا کے وعدہ کا نفاذ بھی "جامع الفصولین" میں مصرح ہے [۵۵] اس سے معلوم ہوا کہ صلب عقد میں دوسرے عقد کی شرط لگانا جائز نہیں' البتہ عقد سے پہلے یا بعد میں دوسرے عقد کا معاہدہ کرنا جائز ہے ۔ شرط لگانے اور وعدہ میں فرق یہ ہے کہ صلب عقد میں شرط لگانے سے بیع کا انعقاد ہی دوسرے عقد سے معلق ہوتا ہے' یعنی اگر دوسرا عقد ہو گا تو بیع منعقد ہو گی ورنہ بیع بھی منعقد نہیں ہو گی ۔ اور بیع ان عقود میں سے ہے جو تعلیق کو قبول نہیں کرتے ہیں جبکہ الگ سے وعدہ کرنے کی صورت میں بیع کی تعلیق لازم نہیں آتی ——— اس تفصیل کی رو سے شرکت متناقصہ کا جواز معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ پہلے ایک بار تین عقود کا معاہدہ ہو جاتا ہے' پھر ہر عقد اپنے اپنے وقت پر بغیر کسی شرط کے ہوتا رہتا ہے ۔ لہٰذا مذکورہ تجویز کے مطابق اگر "ہاؤس فنانسنگ" کا کام کیا جائے تو وہ جائز ہو گا ۔ مگر یہاں بھی مسلسل نگرانی کے فقدان کی وجہ سے عملاً بہت سی شرعی قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ چنانچہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن اس وقت جس طرح کام کر رہی ہے' اس میں متعدد شرعی قباحتیں موجود ہیں ۔

ہاؤس فنانسنگ کو عربی میں التمویل العقاری کہتے ہیں' اور اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل مقالہ ہے جو احقر کی عربی کتاب "بحوث فی قضایا فقهية معاصرة" میں شائع ہو چکا ہے ۔

"کینیڈا" میں "ہاؤس فنانسنگ" کے لئے ایک "کوآپریٹو سوسائٹی" بھی قائم کی

---

[۵۵] جلد اول ص ۲۳۶ الفصل الثامن عشر

گئی ہے۔ جسکے لوگ ممبر بنتے ہیں اور ممبر ہی اس سے سرمایہ حاصل کر کے مکان خریدتے یا بناتے ہیں۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ سوسائٹی کا نفع پھر ممبران کو مل جاتا ہے اور ممبران ہی کو فائدہ ہوتا ہے۔

بیمہ

تأمین (Insurance)

بیمہ بھی آج کل کاروبار کا بڑا حصہ بن گیا ہے۔ کوئی بھی بڑی تجارت اس سے خالی نہیں ہوتی۔ بیمہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو مستقبل میں جو خطرات درپیش ہوتے ہیں کوئی انسان یا ادارہ ضمانت لیتا ہے کہ فلاں قسم کے خطرات کے مالی اثرات کی میں تلافی کروں گا۔ مشہور یہ ہے کہ اس کا آغاز چودھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ دوسرے ممالک کی تجارت میں مال بحری جہاز سے روانہ کیا جاتا تھا۔ بحری جہاز ڈوب بھی جاتے تھے اور مال کا نقصان ہوتا تھا۔ بحری جہاز کے نقصان کی تلافی کے لئے ابتداءً بیمہ کا آغاز ہوا۔ علامہ شامیؒ نے بھی "مستامن" کے احکام میں "سوکرہ" کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے [1] جن خطرات کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے۔ ان خطرات کے لحاظ سے بیمہ کی تین بڑی قسمیں ہیں۔

(ا)—— تأمین الاشیاء (Goods insurance) اسکا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ جو شخص کسی سامان کا بیمہ کرانا چاہتا ہے وہ معین شرح سے بیمہ کمپنی کو فیس ادا کرتا رہتا ہے جسے "پریمیم" (Premium) کہتے ہیں' اور چونکہ پریمیم اکثر قسط وار ادا کیا جاتا ہے' اس لئے عربی میں اسے "قسط" کہتے ہیں۔ اور اس چیز کو حادثہ لاحق ہونے کی صورت میں کمپنی اس کی مالی تلافی کر دیتی ہے۔ اگر اس سامان کو جس کا بیمہ کرایا گیا تھا' کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو بیمہ دار نے جو پریمیم ادا کیا ہے' وہ واپس نہیں ہوتا۔ البتہ حادثے کی صورت میں بیمے کی رقم بیمہ دار کو مل جاتی ہے جس سے وہ اپنے نقصان کی تلافی کر لیتا ہے۔ اس میں جہاز کا بیمہ' گاڑی کا بیمہ' مکان کا بیمہ وغیرہ داخل ہوگئے۔

(۲)—— تأمین المسئولیۃ۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی پر مستقبل میں کوئی ذمہ داری آ سکتی ہے۔ اس ذمہ داری سے نمٹنے کے لئے بیمہ کرایا جاتا ہے۔ مثلاً گاڑی روڈ پر لانے سے حادثے کے نتیجے میں کسی دوسرے کا نقصان ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس صورت میں گاڑی چلانے والے پر مالی تاوان لازم ہو جائے گا۔ اس کا بیمہ کرا لیا جاتا ہے اور حادثے کے

---

[1] ردالمحتار ۴ : ۱۷۰ ایچ' ایم' سعید کمپنی

وقت تاوان کی ادائیگی بیمہ کمپنی کرتی ہے۔ اس کو عموماً (Third Party Insurance) (تھرڈ پارٹی انشورنس) کہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں گاڑی سڑک پر لانے کے لئے کے لئے یہ انشورنس قانوناً ضروری ہے۔ بعض مغربی ممالک میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے گھر کے سامنے سے برف صاف نہ کی اور کوئی شخص اس برف سے پھسل گیا جس سے اس کا جسمانی نقصان ہوا تو وہ گھر والے پر مقدمہ کر کے اس سے بھاری تاوان وصول کرتا ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے بھی گھر کے مالکان بیمہ کرا لیتے ہیں، یہ بھی "تامین المسؤلیہ" کی ایک شکل ہے جس میں اگر تاوان دینا پڑے تو بیمہ کمپنی تاوان ادا کرتی ہے۔

(۳)—— تامین الحیاۃ۔ جس کو (Life Insurance) (بیمہ زندگی) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی بیمہ دار سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ اگر ایک مخصوص مدت میں بیمہ دار کا انتقال ہو گیا تو بیمہ کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثاء کو ادا کرے گی۔ اس کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں مدت مقرر ہوتی ہے، اس مدت میں انتقال ہو گیا تو بیمہ کی رقم ورثاء کو مل جائے گی، اگر اس مدت میں انتقال نہ ہوا تو مدت ختم ہونے سے بیمہ ختم ہو جاتا ہے اور رقم مع سود کے واپس مل جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں مدت مقرر نہیں ہوتی جب بھی انتقال ہو گا تو بیمہ کی رقم ورثہ کو مل جاتی ہے۔

"تامین الاشیاء" اور "تامین الحیاۃ" میں بنیادی فرق یہ ہے کہ "تامین الاشیاء" کی صورت میں وہ خطرہ پیش نہ آئے تو جو قسطیں (پریمیم) ادا کی تھی وہ رقم واپس نہیں ملتی ہے۔ اور "تامین الحیاۃ" میں معینہ مدت میں وفات نہ ہونے کی صورت میں دی ہوئی رقم بمعہ سود واپس مل جاتی ہے۔

بیمہ کی طریق کار اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے تین قسمیں اور ہیں۔

(۱)—— التامین الاجتماعی " حکومت کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتی ہے جس میں افراد کے کسی مجموعے کو اپنے کسی نقصان کی تلافی یا کسی فائدے کے حصول کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے، اسے "گروپ انشورنس" کہتے ہیں۔ مثلاً ملازمین کی تنخواہوں سے تھوڑی سی رقم ہر ماہ کاٹ کر اسے ایک فنڈ میں جمع کر لیا جاتا ہے، پھر ملازم کی وفات یا کسی حادثے کی صورت میں بھاری رقمیں ورثاء کو یا خود ملازم کو ادا کی جاتی ہیں۔ اس کی بے شمار صورتیں ہیں، ان تمام پر ایک اجمالی حکم لگانا مشکل ہے، ہر صورت کا حکم الگ ہو گا۔

(۲)—— " التأمین التبادلی " یا " التأمین التعاونی " — اس کو انگریزی میں (Mutual Insurance) کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے خطرات ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر ایک فنڈ بنا لیتے ہیں اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم میں سے

کسی کو کوئی حادثہ پیش آیا تو اس فنڈ میں سے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے گی۔ اس فنڈ میں صرف ممبران کی رقم ہوتی ہے۔ اور نقصان کی تلافی بھی صرف ممبران کی حد تک ہوتی ہے۔ سال کے بعد حساب کر لیا جاتا ہے۔ اگر ادا کئے گئے معاوضات فنڈ کی رقم سے بڑھ جائیں تو اسی حساب سے ممبران سے مزید رقم وصول کر لی جاتی ہے اور اگر فنڈ میں رقم بچ جائے تو ممبران کو واپس کر دی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے لئے فنڈ میں حصہ کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

ابتداءً بیمہ کی یہی شکل چلی تھی۔ اور شرعاً اس میں کوئی اشکال نہیں۔ اور جتنے علماء نے بیمہ پر گفتگو کی ہے وہ اس کے جواز پر متفق ہیں۔

(۲)—— "التأمین التجاری" یا "التأمین بقسط ثابت" جس کو انگریزی میں (Commercial Insurance) کہتے ہیں۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی قائم کی جاتی ہے، اس کمپنی کا مقصد بیمہ کو بطور تجارت کے اختیار کرنا ہوتا ہے۔ اور اس کا اصل مقصد بیمہ کے ذریعے سے نفع کمانا ہوتا ہے، جیسے دوسری کمپنیاں مختلف کاروبار سے نفع کماتی ہیں۔ یہ کمپنی مختلف قسم کے بیمے کی اسکیمیں جاری کرتی ہے۔ جو بیمہ کرانا چاہتا ہے اس کے ساتھ بیمہ کمپنی کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اتنی رقم کی اتنی قسطیں آپ ادا کریں گے اور نقصان کی صورت میں کمپنی آپ کے نقصان کی تلافی کرے گی۔ کمپنی قسطوں کا تعین کرنے کے لئے حساب کر لیتی ہے کہ جس خطرے کے خلاف بیمہ ہوا ہے وہ کتنی بار متوقع ہے تاکہ ان کے معاوضات ادا کر کے کمپنی کو نفع بچ سکے۔ اس حساب کے لئے ایک مستقل فن ہے جس کے ماہر کو "ایکچوری" (Actuary) کہتے ہیں۔

بیمے کی اسی قسم کا رواج زیادہ ہے، اور اسی کا شرعی حکم علمائے معاصرین میں زیادہ محل بحث بنا ہے۔ اس کے بارے میں علمائے عرب میں سے شیخ ابو زہرہ اور مصطفیٰ الزرقاء کا شدید اختلاف رہا ہے۔ شیخ ابو زہرہ اس کی حرمت کے قائل تھے۔ اور مصطفیٰ زرقاء اس کے جواز کے قائل تھے۔ اس وقت عالم اسلام کے تقریباً تمام مشاہیر علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ البتہ مشاہیر میں سے صرف دو عالم اس کے جواز کے قائل ہیں۔ ایک شیخ مصطفیٰ زرقاء اور دوسرے شیخ علی الخفیف۔

جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس بیمے میں قمار بھی ہے اور ربوا بھی۔ قمار اس لئے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہے۔ جو قسطیں ادا کی گئی ہیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے۔ اسی کو قمار کہتے ہیں۔ اور ربوا اس طرح کہ یہاں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے اور اس میں تفاضل ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے کم رقم دی جاتی ہے اور اسے زیادہ رقم ملتی ہے البتہ

"تامین الحیاۃ" (بیمہ زندگی) میں قمار نہیں' اس لئے کہ وہاں رقم یقیناً واپس مل جاتی ہے' مگر ربوا اور غرر ہے۔ ربوا تو ظاہر ہے۔ غرر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ارکان عقد (ثمن' مبیع یا اجل) میں سے کسی چیز کا مجہول ہونا یا کسی مجہول اور غیر معین واقعے پر موقوف ہونا۔ یہاں غرر اس طرح ہے کہ معلوم نہیں کہ کتنی رقم واپس ہوگی' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جتنی رقم دی تھی وہی بمعہ سود کے واپس ملے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حادثے کی صورت میں زیادہ رقم مل جائے۔

مصطفیٰ زرقاء اور شیخ علی الخفیف کے دلائل کی تفصیل کا تو یہاں موقعہ نہیں البتہ انکے دلائل کا حاصل اور خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ انکے دلائل کا خلاصہ چند باتیں ہیں۔

(۱) ـــــ قمار اور بیمے میں فرق ہے۔ قمار باقاعدہ عقد نہیں' محض ایک لعب اور ہزل ہے۔ اور بیمہ باقاعدہ ایک عقد اور جد ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس عقد کا قمار' ربوا اور غرر پر مشتمل ہونا ہم واضح کر چکے ہیں۔ قمار کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ لعب یا ہزل ہو جد ہونے کی صورت میں بھی قمار متحقق ہو جاتا ہے۔

(۲)ـــ یہاں معقود علیہ وہ روپے نہیں جو حادثے کی صورت میں کمپنی ادا کرتی ہے' بلکہ وہ امان اور اطمینان ہے جو بیمے کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ اور امان کا معاوضہ ادا کرنا جائز ہے۔ اس کے لئے وہ چوکیدار کی مثال پیش کرتے ہیں کہ چوکیدار کی تنخواہ اس امان کا معاوضہ ہوتا ہے جو اس چوکیدار کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے ـــــــــــ اس کا جواب یہ ہے کہ امان معقود علیہ نہیں' معقود علیہ روپے ہی ہیں۔ اور امان اس کا ایک ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ چوکیدار کی مثال میں بھی چوکیدار کا عمل معقود علیہ ہوتا ہے' امان اس کا ثمرہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ چوکیدار کا عمل معقود علیہ بن سکتا ہے' اس لئے وہ جائز ہے۔ لیکن روپے کو معقود علیہ بنانے کی صورت میں مساوات شرط ہے جو بیمے میں مفقود ہے۔

(۳)ـــ "التامین التبادلی" (Mutual Insurance) کے جواز کے تو تمام علماء قائل ہیں۔ اور "التامین التجاری" (Commercial Insurance) بھی اسی کی ایک وسیع صورت ہے۔ بڑے پیمانے پر لوگوں کو ممبر بننے کا موقعہ دینے کے لئے ایک وسیع ادارہ تشکیل دیدیا گیا ہے۔ اس کے منتظمین کو انتظامات کی اجرت ملنی چاہئے۔ بیمہ کمپنی کو جو نفع ملتا ہے وہ اس کے انتظامات کی اجرت ہے۔ اس استدلال کا حاصل یہ ہے کہ "التامین التجاری" بھی "التامین التبادلی" کی طرح ہے ـــــــــ اس کا جواب یہ ہے کہ "التامین التبادلی" ایک تبرع ہے اور "التامین التجاری" معاوضہ ہے۔ تبرع میں غرر متحمل ہوتا ہے' عقد معاوضہ میں غرر متحمل نہیں ہوتا۔

(۴)ـــ ان کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ "بیمہ" ایک عقد جدید ہے۔ اور اصل عقود میں

اباحت ہوتی ہے' جب تک اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔ اور بیمے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے 'اس میں کوئی قباحت نہیں' لہٰذا اس کی گنجائش ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیمے کی شرعی خامیاں قمار' ربوا اور غرر ہم نے بیان کر دی ہیں۔ لہٰذا یہاں اباحت اصلیہ کا قاعدہ نہیں چل سکتا۔

بیمہ کا متبادل

بیمہ کا متبادل ایک تو تعاونی بیمہ (Mutual Insurance) ہے جس میں شرکاء اپنی اپنی مرضی سے فنڈ میں رقمیں جمع کراتے ہیں' اور سال کے دوران جن جن لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا' اس فنڈ سے ان کی امداد کرتے ہیں۔ پھر سال کے ختم پر اگر رقم بچ گئی تو وہ شرکاء کو بحصہ رسدی واپس کر دی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے فنڈ کیلئے چندے کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

اسکے علاوہ اب عالم اسلام کے کئی ملکوں میں "شرکات التکافل" کے نام سے کچھ کمپنیاں قائم ہوئی ہیں جنہیں تجارتی بیمے کے متبادل کے طور پر قائم کیا گیا ہے۔ ان کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر بیمہ دار کمپنی کا شیئر ہولڈر ہوتا ہے' کمپنی اپنا سرمایہ نفع بخش کاموں میں لگا کر اس کا نفع اپنے شیئر ہولڈرز میں تقسیم بھی کرتی ہے' اور کمپنی ہی کے ایک ریزرو فنڈ سے بیمہ داروں کے نقصانات کی تلافی بھی کرتی ہے۔

مجھے ابھی ان کمپنیوں کے مفصل طریقہ کار کی تمام جزئیات پر فقہی نقطۂ نظر سے غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے ابھی میں اس کے بارے میں کوئی ذمہ دارانہ بات نہیں کہہ سکتا۔

مالیات عامہ

(Public Financing)

اس موضوع سے مراد یہ ہے کہ ملک کے اجتماعی اخراجات کیا ہوتے ہیں' ان کا تعین کیسے ہوتا ہے اور ان اخراجات کی تمویل کیسے ہوتی ہے؟ آئین کے مطابق حکومتیں ٹیکس عائد کرتی ہیں۔ اور پارلیمینٹ اخراجات کی تحدید کر کے ان کی اجازت دیتی ہے۔ ہر سال حکومت کی آمدنی اور اخراجات کے تعین کے لئے جو دستاویز تیار کی جاتی ہے' اسے اردو میں میزانیہ اور انگریزی میں بجٹ کہتے ہیں۔

بجٹ وفاقی حکومت کا الگ ہوتا ہے' صوبائی حکومتوں کا الگ اور مقامی انتظامیہ کا الگ ہوتا ہے۔ ایک مجموعی بجٹ وفاقی اور چاروں صوبائی بجٹ کو ملا کر بھی تیار کیا جاتا ہے۔ جس کو (Consolidated Budget) کہتے ہیں۔

بجٹ کے دو حصے ہوتے ہیں ایک حصے میں یہ بات درج ہوتی ہے کہ آنے والے سال میں متوقع اخراجات کیا ہیں اور دوسرے حصے میں یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ سال آئندہ کتنی آمدنی کی توقع ہے۔ اگر متوقع آمدنی اخراجات کے مقابلے میں کم ہو تو کہا جاتا ہے کہ بجٹ میں خسارہ ہو گیا۔ اگر آمدنی اور اخراجات برابر ہوں تو اسے متوازن بجٹ سمجھا جاتا ہے اور اگر آمدنی اخراجات سے زائد ہو تو اسے فاضل بجٹ کہا جاتا ہے۔

اخراجات۔

اخراجات دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) جاری (Current) اخراجات۔ اس سے مراد وہ اخراجات ہیں جن کا فائدہ صرف اس دورانیہ میں حاصل ہو گا' جس کے لئے بجٹ بنایا گیا ہے۔ بجٹ ایک سال کا ہے تو ایک سال کی حد تک ہی فائدہ ہو گا۔ مثلاً حکومت کو جو سود ادا کرنا ہے وہ جاری اخراجات میں شامل ہے۔

(۲) جامد اخراجات۔ وہ اخراجات جن کا فائدہ اس دورانئے کے بعد بھی ہو گا۔ جیسے سڑکوں' پل وغیرہ پر جو اخراجات ہوئے۔ ان کو ترقیاتی اخراجات بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ۹۳-۱۹۹۲ کے بجٹ میں اخراجات اس طرح ہیں۔

جاری اخراجات : ۲۵۷ ارب روپے

ترقیاتی اخراجات : ۷۳ ارب روپے

کل اخراجات : ۴۲۰ ارب روپے

آمدنی

آمدنی بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔(۱) محصولاتی (۲) غیر محصولاتی

محصولاتی آمدنی: اس سے مراد وہ آمدنی ہے جو حکومت کو ٹیکسوں سے حاصل ہوتی ہے۔ ٹیکس دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) بلاواسطہ ٹیکس۔(Direct Tax) جو افراد پر اس طرح عائد ہو کہ وہ اسکا بار کسی اور پر نہ ڈال سکیں۔ جیسے آمدنی، تنخواہ اور جائیداد پر ٹیکس۔

(۲) بالواسطہ ٹیکس۔(Indirect Tax) ایسا ٹیکس جس کا بار دوسرے کی طرف بھی منتقل کیا جاتا ہے۔ جیسے دوکان اور کارخانے پر ٹیکس کہ دوکاندار یا کارخانہ دار قیمتیں بڑھا کر دوسروں پر اس کا بار ڈال سکتا ہے۔ یا "سیلز ٹیکس" جو وصول تو دوکاندار سے کیا جاتا ہے، لیکن دوکاندار ہر چیز کی فروخت کے وقت یہ ٹیکس اپنے خریدار سے وصول کر لیتا ہے۔

معاشیات میں ٹیکس کے اصول بھی بتائے جاتے ہیں۔ ٹیکس لگاتے ہوئے ان اصولوں اور خصوصیات کی رعایت ہونی چاہیے۔

(۱) ٹیکس کی تعداد میں ابہام نہ ہو۔(۲) ٹیکس کی ادائگی کا نظام آسان ہو تاکہ ٹیکس ادا کرنے کے لئے لوگوں کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔(۳) ٹیکس بقدر کفایت ہو۔ حکومت کی ضرورت سے زیادہ بھی نہ ہو اور کم بھی نہ ہو۔(۴) تمام طبقات پر مساوی درجے میں عائد ہو۔(۵) اتنا زیادہ ٹیکس نہ ہو کہ اس سے لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہمیں کاروبار کا فائدہ ہی کچھ نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے نتیجے میں ملک میں عمل پیدائش متاثر ہونے لگے۔(۶) ٹیکس کی مقدار لچکدار ہو۔ اشیاء کی قیمتوں اور آمدنی میں اتار چڑھاؤ سے خود بخود بدل جاتا ہو، بار بار بدلنا نہ پڑے۔ مثلاً کسی چیز پر مقدار مقرر کر کے ٹیکس لگانا غیر لچکدار ہے۔ اور قیمت کے فیصدی تناسب سے ٹیکس طے کیا جائے تو یہ لچکدار ہے جو اس چیز کی قیمت بدلنے سے بدلتا رہے گا۔(۷) ٹیکس کا نظام ایسا نہ ہو جو معاشی ترقی پر اثر ڈالے۔

غیر محصولاتی آمدنی: اس سے مراد وہ آمدنی ہے جو سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً واپڈا، فون، پی آئی اے، پوسٹ آفس اور ریلوے وغیرہ سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ غیر محصولاتی آمدنی ہے۔

خسارہ اور خساراتی تمویل

اخراجات میں سے آمدنی منہا کر کے جو باقی بچے وہ خسارہ ہے۔ مثلاً پاکستان کے ۹۳-۱۹۹۲ کے بجٹ میں خسارہ کی صورت یوں ہے۔

کل اخراجات : ۳۳۰ ارب روپے

کل آمدنی : ۲۶۵ ارب روپے

خسارہ : ۶۵ ارب روپے

اس خسارے کو پورا کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کرنا "خساراتی تمویل" (Deficit Financing) کہلاتا ہے۔ خسارے کی تمویل کے لئے حکومت قرضے لیتی ہے۔ قرضے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱)—— بیرونی قرضے۔(Foreign Loans) جو دوسرے ممالک کی حکومتوں یا بین الاقوامی اداروں سے لئے جاتے ہیں۔

(۲)—— داخلی قرضے (Internal Loans) جو اندرونی ملک بنکوں' مالیاتی اداروں یا عوام سے لئے جاتے ہیں۔

پھر داخلی قرضے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) غیر بنکی (Non - Banking) جو عوام سے لئے جاتے ہیں۔ عوام سے قرضے لینے کے لئے "سرکاری تمسکات" جاری کئے جاتے ہیں۔ آج کل حکومت کی طرف سے مختلف سیونگ اسکیمیں اسی غرض سے جاری کی گئی ہیں۔ اس میں عام آدمی یہ "سرکاری تمسکات" خرید کر پیسے حکومت کو دیدیتا ہے' مثلاً انعامی بانڈ' نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ' خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ وغیرہ۔ ان تمام تمسکات پر آج کل عوام کو سود دیا جاتا ہے۔

(۲) بینکی قرضے۔(Banking Loans) اس کو "نوٹ چھاپنے" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعتاً حکومت نوٹ نہیں چھاپتی ہے۔ اس لئے کہ آئینی طور پر نوٹ چھاپنے کا اختیار حکومت کو نہیں بلکہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان کو ہے۔ اس تمویل کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت "ٹریژری بل" جاری کر کے اسٹیٹ بنک سے قرضہ لیتی ہے۔ اتنی رقم حکومت کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جاتی ہے۔ اسی کو "نوٹ چھاپنا" کہہ دیتے ہیں۔ حکومت جب اسٹیٹ بنک کو ادائیگی کرتی ہے تو عموماً آج کل اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اتنی رقم کے مزید "ٹریژری بل" جاری کر دیتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ

حکومت اسٹیٹ بنک کو کہہ دیتی ہے کہ میرے اکاؤنٹ سے اتنی رقم کم کردو۔
پھر قرضے کی تین مدات ہوتی ہیں جو بجٹ میں لکھی جاتی ہیں۔
(۱) مستقل قرضے :۔(Permanent Loans) یہ وہ قرضے ہیں جو حکومت "سرکاری تمسکات" کے ذریعے عوام سے وصول کرتی ہے۔ جو واپس نہیں کئے جاتے ہیں۔ البتہ ان "تمسکات" کو ثانوی بازار(Secondary Market) میں بیچا جاسکتا ہے جیسے پرائز بانڈ وغیرہ۔
(۲) رواں قرضے :۔(Floating Loans) اس سے مراد وہ قرضے ہوتے ہیں جو حکومت اسٹیٹ بنک سے لیتی ہے۔
(۳) قصیر المیعاد قرضے :۔ (Unfunded Loans) اس سے مراد وہ دستاویزات ہیں جو کم مدت کے لئے ہوں۔ جیسے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ، نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ، ماہانہ آمدنی، خاص ڈپازٹ وغیرہ۔
خساراتی تمویل میں زیادہ حصہ داخلی قرضوں کا ہوتا ہے۔ بیرونی قرضے اس کے مقابلے میں بہت کم ہوتے ہیں۔ مثلاً ۹۳-۱۹۹۲ء میں جو قرضے لئے گئے ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

داخلی بنکی قرضے	:	۲۱	ارب روپے
داخلی غیر بنکی قرضے	:	۴۸	ارب روپے
بیرونی قرضے	:	۱۷	ارب روپے
کل قرضے	:	۸۶	ارب روپے

قرضوں کی رقم صافی طور پر لکھی جاتی ہے۔ یعنی صرف قرضے کی رقم ہی لکھی جاتی ہے۔ اس پر جو سود ادا کرنا ہوگا وہ اخراجات میں لکھا جاتا ہے۔ آج کل ہمارے ملک میں سود کی مقدار اصل رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً ۹۳-۱۹۹۲ء میں حکومت کو جو ادائگی کرنی ہے وہ یہ ہے

اصل قرضے	:	۳۳	ارب روپے
سود	:	۸۶	ارب روپے
کل ادائگی	:	۱۱۹	ارب روپے

پھر سود میں بھی زیادہ حصہ داخلی قرضوں کا ہوتا ہے۔ بیرونی سود اس کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا ۸۶ ارب روپے میں ۵۸ ارب روپے داخلی سود ہے اور ۱۵ ارب روپے بیرونی سود ہے۔ (باقی ۱۳ ارب روپے کی بجٹ میں وضاحت نہیں کی گئی)۔

اب تک جو قرضے حکومت کے ذمے واجب الاداء ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

کل قرضے	:	۱۲۰۰	ارب روپے
داخلی	:	۱۰۰۰	ارب روپے
بیرونی	:	۲۰۰	ارب روپے

داخلی قرضوں کی تفصیل

کل قرضے	:	۱۰۰۰	ارب روپے
اسٹیٹ بنک	:	۶۷۵	ارب روپے
عام بنک	:	۱۱۰	ارب روپے
خاص ڈپازٹ	:	۲۰۰	ارب روپے

بیرونی قرضوں کی تفصیل

بیرونی حکومت سے لئے گئے	:	۱۹۰	ارب روپے
عالمی اداروں سے لئے گئے	:	۱۱۰	ارب روپے
کل	:	۲۰۰	ارب روپے

ان تمام اعداد و شمار سے معلوم ہو گیا کہ حکومت کی تمام ادائیگیوں کا بہت زیادہ حصہ داخلی ہے اور بہت کم حصہ بیرونی ہے۔

خساراتی تمویل کا متبادل طریقہ

جب غیر سودی معیشت کی بات کی جاتی ہے تو خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں سب سے مشکل سوال یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر سود پر قرض لینے کا دروازہ بالکل بند کر دیا جائے تو بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لئے جو اندرونی اور بیرونی قرضے لئے جاتے ہیں ان کے حصول کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ جہاں تک تجارتی اداروں کا تعلق ہے' ان میں شرکت اور مضاربت متصور ہو سکتی ہے۔ لیکن حکومت کو جن اخراجات کے لئے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی ہے ان میں سے بہت بھاری تعداد ایسے کاموں کی ہے جو نفع بخش نہیں ہے۔ مثلاً سڑک' پل اور ڈیم وغیرہ بنانا۔ افواج کے لئے جدید اسلحہ فراہم کرنا' اور اس طرح کے دوسرے ایسے منصوبے جن کا فائدہ پوری قوم کو پہنچتا ہے' لیکن ان سے براہ راست کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔

اس سوال کے جواب میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بجٹ کے خسارے کو کم کرنے کے لئے سب سے پہلے ان مسرفانہ اخراجات کو ختم کرنے کی ضرورت ہے جن کا مظاہرہ شب و روز حکومت کے مختلف اقدامات میں ہوتا رہتا ہے' اور جن کا ایک غریب

ملک میں کوئی جواز نہیں، اسی طرح ہمارے ملک میں رشوت اور بد دیانتی کی بنیاد پر بھی بہت بھاری رقمیں ضائع ہوتی ہیں، جن کے سدّباب کی ضرورت ہے، لیکن یہ حقیقت پھر بھی اپنی جگہ ہے کہ اگر مسرفانہ اخراجات کو ختم کرنے اور بد دیانتی کو دور کرنے کے باوجود بھی ملکی ضروریات کے پیش نظر بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لئے دوسرے ذرائع تمویل کی ضرورت باقی رہے گی۔ موجودہ حالات میں اس غرض کے لئے اندرونی اور بیرونی قرضے سود پر لئے جاتے ہیں، سود کے خاتمے کے بعد حکومت کی مختلف ضروریات کے لئے مختلف طریقہ ہائے تمویل اختیار کئے جاسکتے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں :

۱۔ حکومت کے جو ادارے نفع بخش ہیں، مثلاً ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کا محکمہ، ان کی تمویل کے لئے مضاربہ سرٹیفکیٹ جاری کئے جاسکتے ہیں، یعنی جو لوگ یہ مضاربہ سرٹیفکیٹ لیں، وہ اس تجارتی ادارے کے منافع میں بحصہ رسدی شریک ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی شاہراہ یا پل تعمیر کرنا ہے تو اس کے استعمال پر فیس عائد کی جاسکتی ہے جس سے وہ منصوبہ بھی نفع بخش ہو جائے اور اس میں بھی عوام کو مضاربہ سرٹیفکیٹ جاری کئے جاسکتے ہیں۔

۲۔ جو منصوبے کسی بھی صورت میں نفع بخش نہ ہوں، ان کی تمویل کے لئے ایسے غیر سودی بونڈ جاری کئے جاسکتے ہیں، جن پر کوئی معاوضہ نہ دیا جائے، البتہ ان کے حاملین کو ٹیکس میں چھوٹ دی جائے۔ ٹیکس کی چھوٹ کو زیادہ سے زیادہ پرکشش بنایا جاسکتا ہے، ٹیکس چونکہ عوام پر حکومت کا کوئی دَین نہیں ہے، اس لئے اس کی معافی یا اس میں رعایت سود میں داخل نہیں ہوگی۔ حکومت ٹیکس لگانے میں اور بعض شعبوں کو چھوٹ دینے میں مختلف عوامل کو پیش نظر رکھتی ہے اگر یہ عامل بھی پیش نظر رہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۳۔ ایک یہ تجویز بھی قابل غور ہے کہ حکومت کو قرضے دیگر سرکاری تمسکات لینے والوں کو ان کے قرضوں پر کوئی مشروط اور طے شدہ اضافہ تو نہ دیا جائے، لیکن کبھی کبھی کیف ما اتفق کچھ انعام دیدیا جائے۔ جس کے مطالبہ کا قانوناً کسی کو کوئی حق نہ ہو، ملیشیا میں اس تجویز پر عمل ہو رہا ہے۔ چونکہ اس طریق کار میں انعام نہ مشروط ہے، اور نہ اس کی شرح طے شدہ ہے، اور نہ اس کا ملنا یقینی ہے، اور نہ اس کا قرض دینے والوں کی طرف سے مطالبہ ہے۔ اس لئے نظریاتی اعتبار سے اس پر رباکی تعریف صادق نہیں آئے گی۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ متواتر عمل کے نتیجے میں یہ "المعروف کالمشروط" کی زد میں آجائے۔ لہٰذا ایک تجویز اور بھی ہے کہ اس زیادہ ادائیگی کو ملک کی مجموعی قومی پیداوار کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ یعنی قرض کی مدت میں مجموعی قومی پیداوار میں جتنا اضافہ ہو، اتنا ہی اضافہ عوام کو دیا جائے۔ اور اگر کوئی اضافہ نہ ہو تو کوئی اضافہ نہ دیا جائے۔ اس تجویز کے بارے

میں ابھی احقر کو نفیاً یا اثباتاً کسی جانب جزم نہیں ہے، لیکن اہل علم کو اس پر غور ضرور کرنا چاہئے۔

۴۔ حکومت کو خود اپنے سرکاری کاموں کے لئے، نیز افواج کے لئے بہت سے مشینی سامان کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی تمویل کے لئے اجارہ کا طریقہ بھی بآسانی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بعض مالیاتی اداروں سے وہ سامان اجارہ پر حاصل کرلیا جائے۔

۵۔ اس کے علاوہ ایک کثیر المقاصد طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت اپنے اخراجات کی تمویل کے لئے ایک تجارتی مالیاتی ادارہ قائم کرے۔ (یہ ادارہ سرکاری شعبے میں بھی قائم کیا جاسکتا ہے، اور اسے نیم سرکاری بھی بنایا جاسکتا ہے) یہ ادارہ عوام کے لئے مضاربہ سرٹیفکیٹ جاری کرے۔ اور ان سرٹیفکیٹ کے ذریعہ عوام کی رقموں سے حکومت کو مختلف کاموں میں شرکت، مضاربت اجارہ اور مرابحہ کی بنیاد پر تمویل کرے، جن کا تفصیلی طریق کار بنکاری کے بیان میں گزر چکا ہے۔ اس تمویل کے نتیجے میں جو آمدنی حاصل ہو، وہ مضاربہ سرٹیفکیٹ کے حاملین میں بحصہ رسدی تقسیم کی جائے۔ یہ مضاربہ سرٹیفکیٹس ثانوی بازار میں قابل بیع و شراء بھی ہو سکتے ہیں اور اس طرح عوام کو یہ اطمینان بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی لگائی ہوئی رقموں کو جب چاہیں، ثانوی بازار میں فروخت کر کے واپس حاصل کر سکتے ہیں اور اگر سرٹیفکیٹ اپنے پاس رکھنا چاہیں تو مذکورہ ادارے کی آمدنی میں حصہ دار ہو سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مختلف ضروریات کے سلسلے میں مختلف طریق کار اختیار کئے جاسکتے ہیں اور ان کا بہتر نظام وضع کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اندرونی قرضوں میں ایک بہت بڑی تعداد اسٹیٹ بنک کے قرضوں کی ہوتی ہے۔ اس پر سود کا لین دین محض ایک کتابی جمع خرچ ہے، اس کو ختم کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔ اسی طرح وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان قرضوں کے لین دین میں بھی سود کی کارروائی بآسانی ختم کی جاسکتی ہے، جس میں کوئی دشواری نہیں۔

جہاں تک بیرونی قرضوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں اگر حکومت سنجیدگی کے ساتھ کوشش کرے تو دوسرے ممالک کو بھی اسلامی طریقہائے تمویل کی بنیاد پر رقمیں فراہم کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ بیرونی قرضے دینے والوں کو اصل غرض اس بات سے ہے کہ انہیں نفع حاصل ہو، نفع حاصل کرنے کا طریق بذات خود مقصود نہیں۔ اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اب بھی بہت سے ممالک قرض دینے کے ساتھ ساتھ یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ سامان ہمارے ملک سے ہی خریدا جائے، جب سامان ان سے خریدنا ہی ہے تو قرض کے بجائے سامان ہی کو مرابحہ مؤجلہ کی بنیاد پر لینے میں کیا دشواری ہے؟ اور اب پوری دنیا

میں اسلامی طریقہائے تمویل رفتہ رفتہ پہچانے جانے لگے ہیں۔ آئی 'ایم 'ایف (I.M.F) اور ورلڈ بنک میں ان پر باقاعدہ ریسرچ ہو رہی ہے اور ان میں سے بعض کی تائید میں مغربی مصنفین کے مقالات بھی آرہے ہیں۔ آئی ایف سی I F C (انٹرنیشنل فائینانس کارپوریشن) جو عالمی بنک کے طرز کا ایک ادارہ ہے اور نجی تجارتی اداروں کو قرضے دیتا ہے۔ اب اسلامی بنکوں اور مالیاتی اداروں سے اسلامی طریقہائے تمویل کی بنیاد پر از خود معاملات کر رہا ہے۔ ان حالات میں اگر اسلامی ممالک سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ دوسری حکومتوں سے اس بنیاد پر معاملات کرنے کی کوشش کریں تو اس میں کامیابی زیادہ مشکل نہیں۔

و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

والصلاة والسلام علی نبیہ الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

تصانیف

شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی

- آسان نیکیاں
- اندلس میں چند روز
- اسلام اور سیاست حاضرہ
- اسلام اور جدت پسندی
- اصلاح معاشرہ
- اصلاحی خطبات (۱۴ جلد)
- احکام اعتکاف
- اسلام اور جدید معیشت وتجارت
- اکابر دیوبند کیا تھے؟
- بائبل سے قرآن تک (۳ جلد)
- بائبل کیا ہے؟
- تراشے
- تقلید کی شرعی حیثیت
- جہان دیدہ (بیس ملکوں کا سفرنامہ)
- حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق
- حجیت حدیث
- حضورؐ نے فرمایا (انتخاب حدیث)
- حکیم الامت کے سیاسی افکار
- درس ترمذی (۳ جلد)
- دینی مدارس کا نصاب ونظام
- ضبط ولادت
- عیسائیت کیا ہے؟
- علوم القرآن
- عدالتی فیصلے۔ (شرعی عدالت عظمیٰ کے فیصلے)
- فرد کی اصلاح
- فقہی مقالات
- مآثر حضرت عارفی
- میرے والد، میرے شیخ
- ملکیت زمین اور اس کی تحدید
- مطابق سنت نماز بخوانید
- نقوش رفتگاں
- نفاذ شریعت اور اس کے مسائل
- نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے
- ہمارے عائلی مسائل
- ہمارا تعلیمی نظام
- ہمارا معاشی نظام

تکملة فتح الملهم شرح صحیح مسلم (۳ جلد) (عربی)

ماهي النصرانية؟ (عربی)

نظرة عابرة حول التعليم الإسلامي (عربی)

أحكام الأوراق النقدية (عربی)

بحوث في قضايا فقهية معاصرة (عربی)

The Authority of Sunnah.
The Rules of I' tikaf.
What is Christianity?
Easy Good Deeds.
Perform Salah Correctly.

مُدیرِ البلاغ کے قلم سے بیس مُلکوں کا معلومات آفریں سفرنامہ

جہانِ دیدہ

جو البلاغ کی قسط وار اشاعت کے دوران علمی و ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کے بعد بہت سے اضافوں کیساتھ پہلی بار کتابی شکل میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔

- مسلمانوں کے تاریخی مراکز کے حالات۔ قصۂ زمیں برسرِ زمیں
- تاریخ کے دلچسپ اور بصیرت افروز واقعات
- مشہور اسلامی شخصیتوں کے روح پرور تذکرے

سعودی عرب، عراق، مصر، الجزائر، اردن، شام، ترکی، قطر، انڈونیشیا، بنگلہ دیش، انڈیا، جنوبی افریقہ، چین، برطانیہ، امریکہ، فرانس، کینیڈا، کینیا، اور سنگاپور کے مشاہدات و تاثرات۔

مولانا محمد تقی عثمانی کے دلکش اور بہار آفریں قلم سے

۶۸۶ صفحات۔ نفیس کتابت وطباعت۔ خوشنما جلد اور گردپوش روپے

ادارۃ المعارف کراچی

پوسٹ کوڈ نمبر ۷۵۱۸۰ ● فون ۳۱۲۵۰۵

نقوشِ رفتگاں

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

اِدارۃُ المَعارِف کراچی ۱۴